بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیمی، تربیتی اور تبلیغی مجلّہ

ماہنامہ

الفرقان

ربوہ

جنوری ۱۹۶۳ء

ایڈیٹر

ابو العطاء جالندھری

بدل اشتراک

پاکستان و بھارت:- چھ روپے ۔ دیگر ممالک:- تیرہ شلنگ

اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں

معزز قارئین کرام! مندرجہ ذیل سطور آپ کی خاص توجہ کے لئے عرض ہیں:-

اوّل- رسالہ الفرقان ایک دینی اور تبلیغی رسالہ ہے۔ اس کی اشاعت اسی نقطۂ نظر سے ہو رہی ہے۔ اس میں کسی قسم کے تجارتی منافع مدّنظر نہیں۔ اسلئے آپ جب اس کی توسیعِ اشاعت کیلئے جدوجہد فرمائیں گے تو گویا ایک کارِ ثواب میں حصہ لیں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ براہِ مہربانی اس نئے سال میں رسالہ الفرقان کے لئے مزید خریدار پیدا فرمائیں۔

دوم- رسالہ کا چندہ پیشگی آنا لازمی ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے مقرر ہے۔ منی آرڈر کرتے وقت آپ فیس منی آرڈر اس میں سے وضع فرما سکتے ہیں۔ وی پی کرنے کی اجازت دیکر بھی رسالہ جاری کرا سکتے ہیں مگر اس صورت میں آٹھ آنے خرچ زائد پڑ جاتا ہے۔

سوم- اس وقت **بقایاجات** کی وجہ سے رسالہ بہت **زیر بار** ہو رہا ہے۔ اندازاً سات ہزار روپیہ کی رقم بقایاجات میں ہے اگر دس سالہ خریداروں کی امانت نہ ہوتی تو رسالہ کا چلنا سخت دشوار تھا۔ بقایاجات کی وصولی کے لئے اس سال خاص مہم جاری کی جا رہی ہے۔ احباب سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ سے **الفرقان** کے بقایا وصول کروا کر ثواب حاصل فرمائیں۔

چہارم- دس سالہ خریداری کی مجموعی میعاد دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء تک ہے۔ متعدد احباب نے دریافت فرمایا ہے کہ اب بھی اس فہرست میں وہ شامل ہو سکتے ہیں۔ سو **اعلان** کیا جاتا ہے کہ اس سال کے لئے **آٹھ سالہ** خریداری کی **دوسری فہرست** جاری کی گئی ہے۔ جو دوست اس میں شمولیت فرمائیں وہ جلد آٹھ سال کا چندہ ۴۸ روپے یکمشت ارسال فرما دیں۔ انہیں آٹھ سال تک رسالہ بھی ملتا رہے گا انشاء اللہ اور دسمبر سنہ **۱۹۷۰ء** تک ان کا نام دعا کے لئے معاونینِ الفرقان میں بھی شائع ہوتا ہوتا رہے گا۔ اس کے لئے حجم میں دو صفحے کا اضافہ کیا جائے گا۔ احباب اس طرف بھی جلد توجہ فرمائیں۔

پنجم- اس سال رسالہ کی تاریخِ اشاعت ہر انگریزی ماہ کی **دس تاریخ** مقرر ہے۔ خریدار حضرات کے لئے لازمی ہے کہ رسالہ نہ ملنے کی صورت میں اوّلین فرصت میں یعنی زیادہ سے زیادہ **دو ہفتے** کے اندر اندر اطلاع فرما دیں تب دوبارہ رسالہ بھیجا جائے گا ورنہ نہیں۔ اس قاعدہ کی سختی سے پابندی فرمائی جائے کیونکہ رسالہ باقاعدہ اور پوری پڑتال کے بعد پوسٹ کیا جاتا ہے اسلئے اپنے پوسٹ آفس سے بھی ضرور تحقیق فرمایا کریں۔

ششم- جملہ مضامین ایڈیٹر کے نام اور رقوم مینیجر کے نام ارسال فرما دیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ ارسال فرمائیں۔ اپنا پتہ تبدیل ہونے پر فوری طور پر دفتر کو مطلع فرما دیں ورنہ دفتر ذمہ وار نہ ہوگا۔

مینیجر ماہنامہ الفرقان۔ ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا ط

تعلیمی، تربیتی اور تبلیغی مجلّہ

ماہنامہ الفرقان ربوہ

جنوری سنہ ۱۹۶۳ء ــــ شعبان سنہ ۱۳۸۲ھ

(ایڈیٹر)

ابوالعطاء جالندھری

سالانہ بدل اشتراک	اعزازی اراکینِ ادارہ
پاکستان و بھارت ــــ چھ روپے	• محترم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب
دیگر ممالک ــــ تیرہ شلنگ	• محترم قاضی محمد نذیر صاحب فاضل لائلپوری
فی پرچہ ــــ دس آنے صرف	• محترم شیخ مبارک احمد صاحب آف نیروبی ۔
بدل اشتراک بنام مینیجر الفرقان پیشگی آنا چاہیئے !	• محترم مولانا محمد سلیم صاحب آف کلکتہ

جلد ۱۳ شمارہ ۱ — ماہنامہ الفرقان ربوہ — شعبان ۱۳۸۲ جنوری ۱۹۶۳ء

مندرجات

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں محبت (اسلام اور عیسائیت کا موازنہ)	ایڈیٹر	ص۳
۲۔ ختم نبوت کا حقیقی مفہوم	"	ص۵
۳۔ جناب مودودی صاحب کے "جواب" پر تبصرہ	جناب عبدالحی تفضل صاحب مبلغ انچارج صوبہ بہار	ص۶
۴۔ رسالہ "ایلیا" کے جواب میں مزید ایک حوالہ	جناب شیخ عبدالقادر صاحب لاہور	ص۸
۵۔ بینک آف ربوہ (ایک تحقیقی مقالہ) یمحق اللہ الربٰو ویربی الصدقات کی عملی تفسیر	جناب ملک محمد مستقیم صاحب ایڈووکیٹ منٹگمری	ص۹

قابلِ توجہ اور ضروری اعلان

اگر آپ کے رسالہ پر اس گول دائرہ میں ضرب × کا سرخ نشان ہے تو اس کے معنے ہیں کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے۔ فوراً چندہ مینجر الفرقان کے نام ارسال فرما دیں ورنہ آئندہ شمارہ وی پی آئے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ اگر خدانخواستہ آپ خریداری جاری نہ رکھنا چاہیں تو فوراً مطلع فرما دیں۔

مینجر الفرقان ربوہ

درویشانِ قادیان نمبر

یہ نہایت اہم تبلیغی اور تربیتی نمبر انشاء اللہ العزیز پوری آب و تاب سے شروع مارچ ۱۹۶۳ء میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ یہ نمبر گویا پندرہ سالہ دورِ درویشی کی مستند تاریخ ہوگا۔ آپ خود بھی اس خاص نمبر کے حصول کی کوشش کریں اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی تحریک فرما دیں۔ یہ نمبر الفرقان کے ڈیڑھ صد صفحات اور بکثرت تاریخی تصاویر پر مشتمل ہوگا انشاء اللہ۔

خریداروں کو یہ نمبر بھی عام چندہ میں ملے گا۔

الفرقان کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔

مینجر الفرقان ربوہ

اداریہ

اللہ تعالیٰ کی بے پایاں محبت

اسلام اور عیسائیت کے عقیدہ کا موازنہ

"ہمارا خدا خاک کر دینے والی آگ ہے" (عبرانیوں ۱۲/۲۹)

پادری صاحبان مسلمانوں میں اپنی تبلیغ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ "خدا محبت ہے۔ اسی لئے اس نے دنیا کی نجات کے لئے اپنے اکلوتے کو بھیجا اور وہ سب انسانوں کے گناہ اٹھا کر صلیب پر مصلوب ہوگیا"۔ اس "تبلیغ" کا ہر حصہ قابلِ تحقیق ہے کیونکہ حضرت مسیح کا صلیب پر مرنا بھی ثابت نہیں۔ اور حضرت مسیح کا ابن اللہ ہونا بھی سراسر غلط ہے۔ پھر از روئے عیسائی عقائد خدا تعالیٰ کا محبت ہونا بھی درست ثابت نہیں ہوتا۔

اسلام کے رُو سے بلاشبہ حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے بے پایاں محبت ہے۔ اسلام یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہر سچے مذہب میں ابتداء میں یہی عقیدہ پایا جاتا تھا مگر موجودہ عیسائیت کے موجودہ نظریات اس عقیدہ سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتے کہ خدا محبت ہے۔ اس پہلو سے مختصر موازنہ یہ ہے کہ:۔

اوّل۔ عیسائیت اللہ تعالیٰ کو صرف اسرائیل کے رب کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اسی لئے بائیبل میں بار بار "اسرائیل کے خدا" (مثلاً زبور ۵۹/۹) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی بناء پر مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ:۔

"وہ اسرائیلی ہیں اور لے پالک ہونے کا حق اور جلال اور عہود اور شریعت اور عبادت اور وعدے انہیں کے ہیں۔ اور قوم کے بزرگ انہیں کے ہوئے ہیں اور جسم کے رُو سے مسیح بھی انہیں میں سے ہوا" (رومیوں ۹/۴)

مگر اسلام نے اللہ تعالیٰ کو ربّ العالمین قرار دیا ہے۔ وہ ساری کائنات کا خالق اور رب ہے۔ اسے سب سے بے انتہا محبت ہے اسلئے اس نے ہر قوم اور ہر اُمت میں اپنے نبی اور رسول بھیجے ہیں اور سب انسانوں کو اپنے فضلوں سے نوازا ہے۔ فرمایا وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر۔ ۲۴) دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہمارا پیغمبر نہ آیا ہو۔

دوسرے۔ عیسائیت کہتی ہے کہ حضرت آدمؑ نے گناہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ساری نسلِ انسانی کو گناہگار ٹھہرا دیا۔ اب ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہگار ہوتا ہے۔ ...

آدم کی توبہ پر اس کا گناہ معاف کیا اور نہ وہ کسی اور کو معاف کرنے پر رضامند ہوا اسلئے سب آدمزاد حتیٰ کہ سب انبیاء بھی گناہ گار ہیں۔ اس کے مقابل اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حضرت آدمؑ دانستہ گناہ نہ کر سکتے تھے وہ خدا کے برگزیدہ نبی تھے نسیان کی حالت میں ان سے جو غلطی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کے رجوع پر اس سے بھی درگزر فرما دیا تھا اسلئے حضرت آدمؑ گناہ گار نہ تھے۔ اگر بفرضِ محال وہ گناہ گار بھی ہوتے تب بھی لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (انعام-۱۶۴) کے قانون کے مطابق ان کی وجہ سے دوسرے انسان گناہ گار نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ ہر بچہ پیدائشی طور پر پاک اور معصوم ہوتا ہے۔ سب نبی ساری زندگی پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ دوسرے عام انسانوں سے اگر گناہ سرزد ہو جائے تب بے مثال محبت کرنیوالا رب اپنے بندوں کی توبہ اور استغفار پر ان کے سب گناہ معاف کر دیتا ہے فرمایا قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ کہ اے میرے بندو! جنہوں نے ارتکاب گناہ سے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ سے سب گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

سوم۔ عیسائیت کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کو ایسے جہنم میں ڈالے گا جو "ہمیشہ کی آگ" (متی ۲۵/۴۱) ہوگی اور یہ بھی لکھا ہے کہ "ہمارا خدا خاک کر دینے والی آگ ہے" (عبرانیوں ۱۲/۲۹) گویا عیسائیت کے نزدیک دوزخ دائمی سزا ہے جس کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔ اسلام گناہ گار کی سزا سے اسکی اصلاح مقصود قرار دیتا ہے اسلئے قرآن مجید نے جہنم کے زمانہ کو ختم ہو جانے والا ٹھہرایا ہے۔ جہنم میں مجرم اسی طرح تربیت پائیں گے جس طرح ماں کی آغوش میں بچے تربیت پاتے ہیں اُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (القارعۃ-۹) جب اللہ تعالیٰ چاہیگا دوزخی دوزخ سے نکل کر نہ ختم ہونے والی جنتوں میں داخل ہو کر دائمی رضاء الٰہی کے وارث بن جائیں گے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (اعراف-۱۵۵) کہ میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔

قارئین کرام! آپ ان تین عقیدوں کے موازنہ سے ہی اندازہ کر لیں کہ عیسائیت اور اسلام میں سے کونسا مذہب اللہ تعالیٰ کی بے پایاں محبت کو پیش کرتا ہے؟

عیسائیوں کا یسوع مسیح کو ابن اللہ کہہ کر اسے گناہگاروں کے عوض مصلوب گردانے میں نہ معقولیت ہے اور نہ ہی محبتِ الٰہی۔ گناہ دل کا ایک زہر ہے اس کا تریاق دل سے پیدا ہوتا ہے جسے توبہ کہتے ہیں۔ مسیحی کفارہ غیر طبعی اور غیر مؤثر چیز ہے پھر جو باپ اپنے بیٹے کو بلاوجہ قتل کر دیتا ہے اس میں جذبۂ رحم اور محبت کہاں ہے؟ دوسرے اس سے کس محبت کی توقع کر سکتے ہیں؟

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو اَلْوَدُوْدُ (بہت ہی پیار کرنیوالا) قرار دیا ہے۔ اسے مومنوں، صادقوں اور نیکوکاروں سے محبت کرنیوالا ٹھہرایا ہے۔ اسے سب مخلوق کا رب قرار دیا ہے۔ پھر خود فرماتا ہے اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ-۲۵۷) کہ میں مومنوں کا دوست ہوں۔ پس یہ خدا زندہ اور محبت کرنیوالا خدا ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ اس کی محبت بے پایاں، لازوال اور بے مثال ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٭

ختمِ نبوّت کا حقیقی مفہوم

"مقامِ ختمِ نبوت" کے زیرِ عنوان چٹان لاہور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا ذیل کا اقتباس شائع ہوا ہے۔ لکھا ہے :-

"اِس مقام (مقامِ نبوت) سے اُوپر ایک اور مقام آتا ہے۔ یہ مقام جامع جمیع خصوصیات و فضائل مختلفہ ہوتا ہے۔ جو انسانیت کا نقطۂ کمال اور منتہائے عروج کہلاتا ہے۔ اصطلاح میں اِس مقام کو "مقامِ ختمِ نبوت" کہتے ہیں۔ اگر کسی چیز کو اِس مقام سے ناپسندیدہ نظر سے دیکھ لیا جائے تو اس کائنات کے ذرّے ذرّے پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس سے نفرت کرے اور اگر کسی چیز کی طرف سے وہ "فائز المقام" رُخ پھیرے تو ساری انسانیت پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے نہ صرف اپنے رخوں کو پھیرے بلکہ دلوں کو پھیرے۔ یہ مقام اللہ پر ایمان اور اس سے محبت کی کسوٹی ہوتا ہے۔ جب تک کوئی ایمان کا دعویدار اس مقام کی اتباع و پیروی کو اپنی زندگی نہیں قرار دے لیتا اس وقت تک اس کا ایمان مقبولِ بارگاہ نہیں ہوتا لیکن جب کوئی شخص اس "مقامِ ختمِ نبوت" کی اتباع کو اپنی زندگی کا وظیفہ اور شعار بنا لیتا ہے تو پھر اس کا ایمان ہی مقبول بارگاہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بھی محبوب بن جاتا ہے اور السابقون الاوّلون اور رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق آسمان کی بلندیوں سے صاحبِ عظمت و جلال نے اعلان فرما دیا کہ آسمان و زمین اور لوح و قلم کا مالک اور اس کی فرمانبردار مخلوق (فرشتے) اس پر سلامتی بھیجتے ہیں۔ پس ہر مسلمان اور مومن پر فرض ہے کہ وہ اس وجودِ قدسی کے گن گائے اور اس کے حضور صلوٰۃ کے تحفے اور سلام کے نذرانے پیش کرے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام تک (بشمولہ) جو انبیاء تشریف لائے ان کی دعوتیں اور ان کی پکاریں محدود قریہ و قوم تھیں اور ضرورت تھی کہ اس مقام جامع جمیع حسنات و فضائل پر کسی کو فائز کیا جائے اور ختمِ نبوت کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے خاندان بنو ہاشم کے ایک دُرِّ یتیم کو سرفرازی بخشی مقامِ ختمِ نبوت پر فائز کیا اور وہ تمام خوبیاں، صفات اور فضائل جو مختلف انبیاء میں جدا جدا تھے اس ایک ہی شخصیتِ احدہ میں جمع فرما دیئے۔

حسنِ یوسف دمِ عیسٰی یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

جس قدر بھی کمال و مراتبِ انسانیہ ہو سکتے ہیں سب اس مقام کے نیچے ہیں۔ اس سے اوپر اور اس کے بعد کوئی مقام فضل و کمالِ انسانیہ نہیں ہے۔" (چٹان ۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء)

گویا خاتم النبیین کے معنے یہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب نبیوں سے افضل اور جامع جمیع صفاتِ نبویہ تھے۔

کیا علماء ختمِ نبوت کے اس حقیقی مفہوم پر اتحاد کرنے کیلئے تیار ہیں؟ ●

بھارت سے ایک مکتوب

جناب مودودی صاحب کے "جواب" پر تبصرہ

دسمبر ۱۹۶۲ء کے الفرقان میں جناب مودودی صاحب کا جو "جواب" شائع ہوا ہے اس کی وجہ سے آپ کے "الفرقان خاتم النبیین نمبر" کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ جناب مودودی صاحب کو انکے رسالہ "ختم نبوت" کا ایسا دندان شکن جواب آپ نے دیا ہے کہ جس کی وجہ سے یہ امید نہیں ہے کہ مودودی صاحب یا ان کے کوئی پیرو اس کا مدلل جواب لکھنے کے لئے قلم اٹھائیں۔

مودودی صاحب کا یہ جملہ کہ "خصوصاً قادیانی حضرات تو ہروقت جواب لکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں" ایک اور حقیقت کی بھی غمازی کرتا ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جن دنوں علماء دیوبند کی طرف سے مودودی صاحب پر فتوے لگ رہے تھے انہی دنوں مولوی ابومحی الدین صاحب سہانپوری نے مودودی صاحب کو "ختم نبوت" کا منکر قرار دیکر مناظرے کا چیلنج دیا تھا۔ مودودی صاحب کو اس چیلنج کے قبول کرنے کی آج تک جرأت نہیں ہوسکی چنانچہ جماعت اسلامی کے ایک سرگرم رکن مولوی محمد امام الدین صاحب رام نگری اپنی تصنیف "جماعت اسلامی کے متعلق فتوٰی دیوبند" کے صفحہ ۱۳ پر اس چیلنج کا تذکرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:-

"ایک مطبوعہ خط جس میں ابومحی الدین سہانپوری نے مولانا مودودی کو مخاطب کیا ہے اور للکارا ہے کہ وہ آکر ابومحی الدین صاحب سے مناظرہ کرلیں۔ اب تک تو ان حضرات کی طرف سے مولانا مودودی پر یہی الزام تھا کہ انہوں نے صحابہ کرام اور ائمہ و محدثین کی توہین کی ہے لیکن اب محی الدین صاحب نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ پتہ لگایا ہے کہ مولانا "ختم نبوت" کو بھی نہیں مانتے اور چونکہ ابومحی الدین صاحب کے چیلنج پر مولانا مناظرے کے لئے نہیں آئے۔ لہذا ثابت ہوا کہ الزام درست ہے۔"

پس مودودی صاحب کا یہ اعتراف کہ "احمدی حضرات ہر وقت جواب لکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں" اس اعتبار سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ خود مودودی صاحب کو "ختم نبوت" کا منکر قرار دیکر انہیں ایک چیلنج دیا گیا تھا۔ جسے وہ آج تک توڑ نہ سکے اور آج جب انہوں نے اس الزام کو بزعم خود ایک سنگ گراں سمجھ کر جماعت احمدیہ پر لگانے کی ناکام سعی کی تو آپ نے انہیں ایسا عبرت ناک جواب دیا ہے کہ جسے وہ کبھی بھی بھول نہ سکیں گے۔ انّ فی ذلک لاٰیۃ لاولی النھیٰ۔

ہم نہیں جانتے کہ مولوی ابومحی الدین صاحب سہانپوری نے کس بناء پر مودودی صاحب کو "ختم نبوت" کا منکر قرار دیا تھا اور کیا ثبوت و دلائل ان کے پاس تھے جن کی بناء پر انہوں نے مودودی صاحب کو ایسا چیلنج دیا جس کا جواب مودودی صاحب سے بن نہ پڑا۔ البتہ مودودی صاحب نے اپنے کتابچہ "ختم نبوت" میں مسئلہ ختم نبوت کی ایسی تشریح پیش کی ہے جس کی وجہ سے وہ ختم نبوت کے منکر قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ مودودی صاحب

ایک طرف یہ لکھتے ہیں کہ :-

"حضورؐ کے ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اسلئے میری اِس مسجد کے بعد دنیا میں کوئی چوتھی مسجد ایسی بننے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو" (ختم نبوت حاشیہ صفحہ ۲)

اور دوسری طرف اسی رسالہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کی خبر دے رہے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امّتِ محمدیہ کے فرد نہیں ہیں بلکہ وہ اسرائیلی نبی ہیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کا آنا یقیناً ختمِ نبوت کے منافی ہے۔

باقی رہا مودودی صاحب کا یہ فرمان کہ وہ قابلِ التفات صرف وزنی باتوں کو ہی سمجھتے ہیں یا یہ کہ انہیں الفرقان میں کوئی وزنی بات نظر نہیں آئی" یہ ایسا خیالِ خام ہے جو بذاتِ خود قابلِ التفات نہیں کیونکہ وہ حضرات جنہوں نے مودودی صاحب کی تحریرات کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے جانتے ہیں کہ مودودی صاحب میں ایک نمایاں کمزوری یہ ہے کہ وہ متضاد باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں اور جب اس پر گرفت ہوتی ہے تو وہ ٹھیک اس مصرع کے مصداق بن جاتے ہیں کہ ؏

کھائیں کدھر کی چوٹ بچائیں کدھر کی چوٹ

اسلئے وہ ہر ایسے موقعہ پر جواب دینے کی بجائے ایسی ہی باتیں لکھ کر صاف نکل جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ علماءِ دیوبند کے ان فتاوی اور اعتراضات کے متعلق جو مودودی صاحب کے خلاف لکھے گئے تھے مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"مَیں نے پوری کوشش کی کہ ان فتووں میں مجھے اپنی کسی ایسی غلطی کا نشان مل جائے جو واقعی مَیں نے کی ہو۔ اور ان حضرات نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دی ہو۔ ایسی کوئی چیز ملتی تو مَیں یقیناً اس کا جواب دینے کی بجائے اپنی اصلاح کر لیتا۔ مَیں نے یہ کوشش بھی کی کہ اگر فی الواقع ان حضرات کو کوئی ایسی غلط فہمی ہوئی ہو جو دیانتاً کسی شخص کو میری کسی تحریر یا عمل سے ہو سکتی ہو تو اسے معلوم کر دوں۔ ان فتووں میں اس طرح کی کوئی چیز نظر آ جاتی تو مَیں اسے صاف کرنے میں بھی ہرگز تامل نہ کرتا۔ لیکن مجھے ان کے غائر مطالعہ کے بعد یہ اطمینان ہو چکا ہے کہ یہ فتوے ان دونوں طرح کی باتوں سے بالکل خالی ہیں اور ان میں بجز تحریف و بہتان اور الزام تراشی کے اور کچھ نہیں ہے لہٰذا مَیں ان پر سکوت اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں"۔

(الانصاف ۲۵ جون ۱۹۵۱ء)

پس مودودی صاحب کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ فریقِ ثانی کے دلائل کو بددیانتی اور بہتان طرازی کے بڑے بڑے سرٹیفکیٹ دیکر بے وزن قرار دیدیا کرتے ہیں اور بے جواب چھوڑ دیا کرتے اور اپنے آپکو خود ہی حق بجانب ٹھہرالیا کرتے ہیں ؏

جب عادت ہو چکی پختہ تو اس کا چھوٹنا مشکل

لہٰذا الفرقان کی باتوں کو مودودی صاحب کا بے وزن قرار دینا تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ان کا خاصہ ہے جو ہر ایسے موقعہ پر ظاہر ہو جایا کرتا ہے۔ ورنہ ہر وہ شخص جو سنجیدگی کے ساتھ الفرقان کے خاتم النبیین نمبر کا مطالعہ کریگا وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائیگا کہ اب اس کا جواب دینے کی جرأت نہ تو مودودی صاحب کو ہو سکتی ہے اور نہ ہی جماعتِ اسلامی کے کسی دوسرے فرد کو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت و عمر میں برکت دے اور زیادہ سے زیادہ خدمتِ سلسلہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آپکی دعاؤں کا محتاج عبدالحق فضل مبلغ انچارج صوبہ بہار

رسالہ "ایلیا" کے جواب میں مزید ایک حوالہ

شیعہ صاحبان کی طرف سے ایک سراسر غلط استدلال کیا جا رہا ہے کہ انبیاء و مرسلین حضرت علیؓ کو قاضی الحاجات سمجھتے تھے اور انہیں سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی یہ بھی روایت ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی کی کوئی تختی ملی ہے اس پر بھی اسی قسم کی دعا مرقوم ہے۔

ہمارے فاضل نامہ نگار جناب شیخ عبد القادر صاحب آف لاہور کا ایک مضمون اس بارے میں الفرقان کی گزشتہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے ذیل کی سطور اسی مضمون کے تتمہ کے طور پر ارسال فرمائی ہیں لکھتے ہیں:-

۱۹۶۱ء میں عجائبات دنیا پر عصر حاضر کی جدید ترین معلومات پر مشتمل ایک کتاب لندن سے شائع ہوئی ہے۔ طوفانِ نوحؑ کے ذکر میں لکھا ہے:-

"طوفانِ نوح کے عالمگیر عقیدہ سے متاثر ہو کر کوہستان ارا راط میں تحقیق کے لئے ایک تازہ مہم بھیجی گئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ کشتی نوح کے باقیات تلاش کرے۔ پہلی جنگ عظیم میں ایک روسی ہوا باز نے یہ بتایا کہ اس نے ارا راط کے پہاڑوں پر اُڑتے ہوئے ایک کشتی کو دیکھا۔ ۱۹۴۳ء میں ایک امریکن مہم نے اس پہاڑ کو سر کیا۔ لیکن اس نے وہاں کچھ نہ پایا۔ نتیجۃً اب یہی سمجھا جاتا ہے کہ روسی ہوا باز نے زمین کے کسی ایسے ٹکڑے کو دیکھا جو کہ فضائی بلندی سے کشتی نما دکھائی دیتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ امریکی سائنسدانوں کی مہم کا کیشیا میں عین اُس وقت موجود تھی جب روسی اس علاقہ میں اپنے پہلے ایٹم بم کا تجربہ کر رہے تھے۔" (ص ۱۹۶)

(The worlds strangest Mysteries by Rupest Furneaux 1961 Odhams Press Ltd, London.)

ایک تحقیقی مقالہ

بینک آف ربوہ،

سُود کے نقصانات اور ان کا علاج

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ کی عملی صورت !

(از جناب ملک محمد مستقیم صاحب ایڈوکیٹ منٹگمری)

حصہ اوّل

بینک کا آغاز یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ زمین کی کل مخلوق کا مرکز انسان ہو۔ وہ سب کا بادشاہ ہو اور سب کا مخدوم۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ انسان نے زمین پر پانی اور ہوا کو اس حد تک ضرور مسخر کر لیا ہے کہ یہ چیزیں اس کی حسبِ خواہش اور ضرورت مفید کام کر رہی ہیں لیکن اس کی اپنی پیدا کردہ اشیاء نے بجائے اس کے کہ اس کی تابع یا خدمت گزار ہوں۔ انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اُن کی خدمت دن رات کرے اور ان کی خاطر اپنے حکومت کے حق سے دستبردار ہو کر اپنے تئیں اُن پر قربان کر دے۔ یہ ایک بھیانک منظر ہے اور انسان کی حالت قابلِ رحم۔

انسان نے کرۂ ارضی پر آباد ہونے کے بعد مال، زر، دولت، بادشاہت، ریاست، سلطنت اور جائیداد، اسباب، سرمایہ کے تخیّل کو جنم دیا۔ اور سونے، چاندی، ہیرے، لعل، جواہرات کی اعلےٰ قیمت مقرر کر کے بلند مقام عطا کیا۔ انسانوں کے کثیر گروہ کو ایک حکم کے تابع کرنے کے لئے اس دولت و زر سے فوج، نظام، تاج و تخت اور پایۂ حکومت کو قائم کیا اور سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اور اس کشش کو جائیداد، مکانات، پھل، سبزی، تیل، گھوڑے، بیل، ہاتھی، گدھے، خادم، غلام و کنیز کا رنگ دے کر دوام بخشا لیکن جلد ہی اس مقام سے گر کر سرمایہ، زر اور ریاست کی غلامی کے گڑھے میں جا پڑا اور مخدوم سے خادم ہو گیا۔ یہ اس زمانہ کا بہت بڑا حادثہ ہے اور صدمہ عظیم۔

کسی زمانہ میں جب یہ چیزیں پتھروں، کاٹھ اور دھاتوں کی مورتیوں کے قدموں پر نثار کی جاتی تھیں تو اُسے بڑا گناہ اور شرک سمجھا جاتا تھا مگر آج انسان۔ جو اشرف المخلوقات، نمائندۂ خدا، حاکم ارضی ہے اپنی بنائی ہوئی اشیاء کے آگے بے دست و پا ہو کر قربان ہو رہا ہے۔ ہر وقت قربان ہو رہا ہے۔ بے دریغ قربان ہو رہا ہے۔ دیکھنے والے خاموش ہیں اور اہلِ دانش اس تماشہ کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔

آج کا آدمی بڑے بڑے کارخانے، دکانیں، فیکٹریاں

اور کمپنیاں کھول رہا ہے - ملازمت کر رہا ہے صنعت و حرفت میں مشغول ہے - دن رات محنت کرتا ہے - اس کی اَن تھک کوشش ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرے اور یہ دولت ہر لحظہ و لمحہ بڑھتی چلی جاوے - حتیٰ کہ وہ پنجۂ فنا میں گرفتار ہو کر زیرِ زمین ہو جاتا ہے -

لیکن انسانی آزادی، اس کے وقار اور اس کے صحیح مقام کو واپس لانے کے لئے ضروری ہے کہ دوسری تمام مخلوق کو اس کے تابع کیا جائے اور وہ اس کی خدمت پر مامور ہوں تا کہ دنیا پھر ایک دفعہ امن و صلح کا سانس لے سکے -

آج سائنس ترقی کے معیار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں جس کا حل سائنس نہ کر سکتی ہو - چنانچہ صحیح طریقِ کار کے دستیاب ہونے پر زمینی خزائن کی اس قدر بہتات ہے کہ اگر وہ ممکن طور پر بروئے کار لائے جاویں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگ دولت اور پیداوار سے مالا مال نہ ہو جائیں -

امرِ واقعہ بھی یہ ہے کہ قدرتی اسباب اور ذرائع اور صنعتی مواد کو ایک طرف پورے مصرف میں نہیں لایا گیا اور دوسری طرف پیشہ ور، مزدور، کاریگر اور کارکن بیکاری کا شکار ہیں - بھوک اور فاقہ کشی نے ان کا خون نچوڑ کر ہڈیوں کو ننگا کر دیا ہے اور تنگ حالی نے انہیں بے گھر اور بے در کر کے عریاں کر رکھا ہے - ہر چیز بکثرت موجود ہے مگر اندازِ عمل غلط ہے - علاج ہے مگر بیماری جاتی نہیں - آخر کیوں ؟ اس لئے کہ دولت چند ہاتھوں میں آ کر جمع ہو گئی ہے اور اس کی قدرتی گردش

تھم گئی ہے جس سے اس کے لیل و نہار میں فرق آ گیا ہے - آئیے ہم اس بازار میں چلیں جہاں یہ دولت پیدا ہوتی ہے - دن دُگنی اور رات چوگنی پروان چڑھتی ہے - جس دنیا میں یہ سکہ ڈھلتا ہے اور چالو ہوتا ہے اس کو زمانہ حاضرہ کی زبان میں بنک (Bank) کہتے ہیں - جس طرح انسانی جسم کے علم کے لئے اس کی ساخت، عظم و لحم کا نظام، رگ و ریشہ کا کام اور گوشت و پوست کے قوام کا جاننا ضروری ہے اسی طرح بنک کی تاریخ اور اس کے کاروبار سے واقفیت کے لئے اس کی پیدائش، پرورش، جوانی، عروج و کمال کا مطالعہ لازمی ہے - وہ اس طرح ہے :-

یہودی لوگ اپنے مصائب کا شکار ہو کر دنیا میں منتشر ہو گئے - وہ دنیا کے ہر گرم و سرد خطہ میں جا بسے - انہوں نے ایسے ملکوں میں پناہ لی جہاں دوسری زبان، دوسرا تمدن، اور مختلف اقوام کے لوگ آباد تھے - باوجود اجنبیت کے ان کے لئے وسیلۂ روزگار ضروری تھا - ملکی امور میں مداخلت ان کے بس کی بات نہ تھی - فوج اور ملازمت کے یہ قابل نہ تھے کیونکہ ان کی نقل و حرکت اور آمد و رفت قابلِ اعتماد نہ تھی اس لئے انہوں نے سانپ کی چالاکی اور بھیڑ کی بے کسی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے دکانداری، تجارت اور پھیری کی ابتدا کی - نہایت قلیل سرمایہ کی نمائش کی تاکہ غربت کے جامہ میں گاہک و خریدار کو مائل کر سکیں، خطرات سے محفوظ رہ سکیں اور دیدنی ملکی مطالعہ کا موقع پا سکیں - دوسرا طریقہ امداد غرباء تھا - یعنی بوقتِ ضرورت تھوڑی بہت مالی امداد کی اور صبر سے واپسی کا انتظار کیا اور دیر ہونے پر کچھ مزید مطالبہ رقم کیا

اور اس طرح **قانونِ سُود** کو رواج دیا۔ جہاں جہاں اُن کے قدم جمے یا جم کر اُکھڑ گئے ہر جگہ انہوں نے تجارت اور سود کو ہی ذریعۂ معاش بنایا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں ۱۴۰۱ء میں پہلا یہودی بنک سپین میں معرضِ وجود میں آیا جہاں صرف روپیہ کی **آمد**، روپیہ کی **رفت** اور **آمد و رفت شماری** کا کام ہوتا تھا۔ بعد میں **تبادلۂ زر** کے کام کا اضافہ ہوا اور رفتہ رفتہ بنک میں بیکار سونے کی بہتات کے **ادھار دینے** کا رواج عام ہو گیا اور اس پر منافع کی شکل میں سُود آنے لگا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں **کاغذی نوٹ** کا اجرا ہوا اور نوٹ کے تبادلہ کا کام سونے یا چاندی کے سکے پر چمک اُٹھا۔ اوّل اوّل یہ نوٹ دھات یعنی سونے یا چاندی کی مقدار کے مساوی چھپتے رہے۔ مگر جوں جوں تجارت بڑھی قرضہ جات کی مانگ بڑھی اور منافع کی حرص بڑھتی چلی گئی کاغذی نوٹ کی تعداد بڑھتی رہی اور دھات کی مقدار کی نسبت کم ہوتی گئی حتّٰی کہ ۱۸۴۴ء میں انگلستان میں پیل ایکٹ کی رُو سے ۳۰۰ فیصدی کے اضافہ کی اجازت قانونی طور پر دیدی گئی یعنی سونے یا چاندی کی مقدار سے ۳۰۰٪ زیادہ کاغذی نوٹ شائع ہو سکے گا تاکہ حکومت کے کاموں کو بخوبی سرانجام دیا جا سکے اور حکومت بھی ان قرضہ جات پر سُود ادا کرنے کی ذمہ وار تھی اور یہ تمام منافع بنک کے حصہ داروں کی جیب خاص میں جاتا تھا جس کو محفوظ کرنے اور زیادہ سے زیادہ ذاتی مصرف میں لانے کے لئے انہوں نے پیچ در پیچ طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ جنگ کے اخراجات اور جنگ کے بعد تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے کروڑہا روپیہ کی ضرورت کو بنک

اس طرح پورا کرتا تھا اور سود کے منافع سے خوشحال ہو جاتا تھا۔ ایسے فوری اور ہنگامی امور کے لئے دھاتی مقدار اور بھی کم کر دی جاتی تھی اور اس صورت حال سے بسا اوقات حکومت کو مشکلات پیش آتی تھیں مگر بنک کے حصہ داروں کا منافع کسی صورت میں نہ کم ہوتا تھا اور نہ وہ خطرہ میں مبتلا ہوتے تھے۔ جنگ جیتی جائے یا نہ، ملک خوشحال رہے یا بدحال۔ مگر سُودی منافع بدستور اپنے معیاری پیمانے کے حساب سے بڑھتا رہتا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے حکومتیں اور نسلاً بعد نسل رعایا سے صرف سُود ادا کرتے رہتی اور اصل زر ہر صورت میں قائم رہتا۔ اور یہ نہ ختم ہونے والا عذاب ایسا مستولی رہتا کہ خونی بغاوت کے سوا اس سے رہائی کا کوئی چارہ کار نہ رہتا۔

سرمایہ بنک

اوّل۔ بنک کے قبضہ میں جس قدر سونا یا چاندی ہوتا اس سے کم سے کم ۳۰۰٪ زیادہ کاغذی نوٹ بنک جاری کر سکتا۔

دوم۔ لوگوں کے لئے روپیہ کی حفاظت کا سوال انہیں مجبور کرتا کہ وہ اپنا ملکیتی روپیہ بنک میں جمع کرائیں۔ جس قدر سرمایہ بنک کے حساب میں یوں جمع ہوتا وہ بھی سونا اور چاندی شمار کیا جاتا اور دوبارہ بنک کو ۳۰۰٪ نوٹ کے اجراء کی اجازت ہوتی۔

سوم۔ عوام کا نوٹوں کو سونا یا چاندی میں تبادلہ کرانے میں کوتاہی برتنا یعنی تبدیل نہ کرانا اور نوٹ سے ہی بازار میں کام چلانا۔ اس طرح سونے اور چاندی

کی مقدار بدستور قائم رہنے سے قوتِ اجراء کا مزید اضافہ بنک کا حق بن جاتا۔

چہارم - بنک نے اصل زر جو قرض پر دیا ہے اس کے ہمراہ سود کا آنا اس کی قوتِ عمل یعنی اضافہ سرمایہ کو طاقت بخشتا۔ یہ سرمایہ حصص کی خریداری کے ذریعہ حصہ داران سے فراہم کیا جاتا۔ اور قانون کے مطابق اس کے قواعد و ضوابط تیار کر کے اشاعت کی جاتی جس پر حکومت وقت اس کی حفاظت اور امداد کی ذمہ دار ہوتی اور بوقتِ ضرورت حکومت بنک سے قرضہ لیتی اور منافع بینکر و حصہ دار حاصل کرتے۔ جوں جوں انفرادی منافع خوری کی مقدار بڑھتی گئی توں توں عوام اور حکومت کی آنکھیں کھلتی گئیں اور حکومت نے اپنے حصص خرید کرنے شروع کر دیئے اور اس طرح ایک ذریعہ نگرانی حساب کتاب اور نفع و نقصان کا سوچا۔ نیز عوام کی چیخ و پکار پر حصص کی خریداری ان کے لئے ارزاں قیمت پر کھول دی تاکہ وہ سب منافع میں شریک ہو سکیں۔ اس ذریعہ سے حکومت اور عوام کی زبان تو بند ہو گئی مگر چونکہ وہ خود اب حصہ دار بن گئے تھے اسلئے مزید اصلاح کی گنجائش نہ رہی اور منافع سود آتا رہا اور آتا رہا اور خوب آتا رہا مگر حکومت اور عوام بینک کی اندرونی بانٹ کو نہ سمجھ سکا۔

بنک کے ذرائع آمد

اوّل - بنک عموماً چالو کاروبار، کارخانہ، مِل یا فیکٹری کے خود حصص خرید کرتا ہے اور بحصہ رسدی منافع وصول کرتا ہے۔

دوم - دیگر تمسکات، ضمانت و کفالت نامے جن کی بناء پر سرمایہ فراہم ہو کر تجارت میں لگایا جاتا اس پر سود۔

سوم - چیک، ڈرافٹ و دیگر کاغذات جن کے ذریعہ تبادلہ زر ہوتا ہے اس کی وصولی، فراہمی اور ادائیگی کے فرائض کی فیس اور کمیشن کی آمد۔

چہارم - چوتھا بڑا ذریعہ سُود ہے جو قرضہ جات بنک پر وصول ہوتا۔ یہ قرضہ جات حکومتِ ملک، غیر ملکی حکومتیں، امراء، تجار و زمیندار، سوسائٹیاں اور کمپنیاں، امدادی انجمنیں اور کارخانہ دار بنک سے لیتے ہیں جس سے سُود کی آمد کے اعداد و شمار حیران کن ہیں۔

سُودی کاروبار اور اس کی آمد کی معمولی مثال اس کے تباہ کُن اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ گزشتہ جنگ میں ایک ملک نے ۱۰۰ کروڑ روپیہ قرض لیا جس کی شرح سُود ۴ فیصدی سالانہ تھی۔ یہ رقم جنگ کے معاً بعد تو ادا ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ مکانات، پُل، راستے، بجلی کے کارخانے، ملیں، اور سٹیشن ریلوے، ٹیلیفون، سٹور، ورکشاپ اور دیگر عمارات سرکاری جنگی نقصان کی وجہ سے بیکار اور قابلِ مرمت ہوتی ہیں پوری طرح کام چلانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے چہ جائیکہ قرض اُتارنے کے لئے پیداوار فروخت کر کے سونا چاندی فراہم کر سکیں۔ سپاہیوں اور فوج کے لئے روزگار۔ بیوگان کے لئے وسیلہ اور یتامیٰ

کے لئے وظائف کی ضرورت ہوتی ہے اور اندرونی اقتصادیات کو سنبھالنے کے لئے بھی سرمایہ درکار ہوتا ہے تاکہ جنگ سے قبل کے حالات پیدا کئے جا سکیں۔ اس موقعہ سے بنک منتظر ہوتے ہیں اور قرضہ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ اور منافع در منافع حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ صورت حال یوں ہوتی ہے کہ ۲۵ سال کے عرصہ میں اصل قرضہ تو اترتا نہیں مگر ۴ فیصدی شرح کے حساب سے ۲۵ × ۴ = ۱۰۰ کروڑ روپیہ مزید سُود واجب الادا ہو جاتا ہے۔ گویا کہ ۲۵ سال کے بعد بنک کو دوسری جنگ کا خرچ سُود میں قوم ادا کرتی ہے۔ بفرض محال آئندہ ۲۵ سال میں یہ سود کی رقم ادا ہو تو اتنے عرصہ میں اتنا ہی سُود تیسری مرتبہ واجب ہو جاتا ہے اور یہ دائرہ برابر قائم رہتا ہے اور سُود کے ہدیہ کا بھگو کسی صورت میں کم نہیں ہوتا اور نہ ہی بصورت موجودہ اسکے کم ہونے کی جب تک چاند اور سورج زمین پر روشنی ڈالتے رہیں گے امید کی جا سکتی ہے۔ مزید برآں اصل زر تاحال قائم ہے یہ سُود ان حصہ داروں کی جیب میں جاتا ہے جو بنک کے مالک ہیں اور حکومت کا کوئی بنک نہیں ہوتا۔ کیونکہ حکومت کا کام تجارت اور بیوپار کرنا نہیں۔ اور جو بنک حکومت کی نمائندگی کرتا ہے اس کے فرائض بالکل مختلف ہیں جن کا ذکر آئندہ ہوگا۔

اس طرح سُود اپنے وراثت میں سُود چھوڑتا ہے جو بیلگ کی طرح بڑھتا ہے اور انسانی جانوں کی قربانی لیتا ہے۔ سُود کی وجہ سے جنگی اخراجات کی مثال یوں دی جا سکتی ہے جیسے ایک اتھاہ گڑھے میں خزانہ کے اندر سے سونا چاندی باہر پھینک دیا جائے اور اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ یہ اس خونی ہولی کی سزا ہے جو ایک نسل کھیلتی ہے۔ اور بعد کی نسلیں بلا وجہ خمیازہ اُٹھاتی ہیں۔ یہ سُودی قرضہ کسی تعمیری کام کے لئے صرف نہیں کیا گیا بلکہ تخریب کی بھینٹ چڑھایا گیا اور قوم ہمیشہ کے لئے ناقابل برداشت بوجھ تلے دب کے رہ جاتی ہے۔ جب تک قوم ادائیگی سُود کو اور معاہدہ کو اخلاقی فرض کے طور پر ادا کرتی رہے گی۔ اس سے نجات مشکل ہے۔ کیا اس بوجھ کے خوف سے آئندہ تنازعات اور جنگیں رُک گئیں یا رُکنے کا امکان ہے؟ نہیں! کیونکہ جب تک قرضہ سُود پر مل سکتا ہے جس کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ اس وقت تک یہ بلائیں نازل ہوتی رہیں گی اور نسل انسانی سُود کے چنگل سے غلامی حاصل نہ کر سکے گی۔

چنانچہ ۱ $\frac{1}{2}$ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر رہا ہے کہ برطانیہ نے فرانس کے بادشاہ پولین سے واٹرلو میں جنگ لڑی اور فتح پائی جس کا چرچا آج تک ان کے کانوں میں گونج رہا ہے اور اس فتح کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ مگر معلوم ہے کہ آج تک اہل انگلستان اسی جنگ کے سُود کی ادائیگی سے فارغ نہیں ہو سکے اور بعد کی جنگوں نے تو انگریزی حکومت کو دیوالیہ کر دیا کہ اب وہ اپنے سابقہ مقام سے گر کر تیسرے درجہ پر آ ٹھہری ہے۔

اس کیفیت کے اندازے کے لئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار کا ملاحظہ مفید ہوگا۔

(۱) حکومت فرانس کے رسالہ میں اقتصادی اعداد و شمار کا اندراج جو ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو شائع ہوا تھا یہ تھا:-

	آمد موکلان	محفوظ سرمایہ	سرمایہ بنک
اُدھار بنک	۴۵۰۰ کروڑ	۱۰۰ کروڑ	۱۰۰ کروڑ
سوسائٹی عامہ	۲۴۱۰۰ ″	۴۰۰ ″	۷۵۰ ″
نیشنل بنک	۱۶۲۰۰ ″	۳۰۰ ″	۵۲۶ ″
کنٹرولر نیشنل	۱۳۴۰۰ ″	۱۰۰ ″	۱۰۰ ″
	۵۸۲۰۰ کروڑ	۹۰۰ کروڑ	۱۴۷۶ کروڑ

گویا کہ ان چار بنکوں نے ۱۴۷۶ کروڑ کے سرمایہ سے کام شروع کیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ۹۰۰ کروڑ کا سرمایہ **عمارات، کفالت ہا، قرضہ جات**، اور دیگر محفوظ صورتوں میں جمع کر لیا اور بنک کی حیثیت ۵۸۲۰۰ کروڑ روپیہ پر حاوی ہوگئی اور اس سے فائدہ یعنی سود کمانے کی صورت پیدا رہی۔

یہی حال انگلستان کے پانچ مشہور بنک کے مالکوں کا ہے۔ ویسٹ منسٹر[1]۔ لائڈ[2]۔ نیشنل[3]۔ پراونشل[4]۔ بارکلے اینڈ مڈلینڈ[5] صرف چھ چھ کروڑ کے سرمایہ سے کاروبار شروع کرتے ہیں اور چند سالوں میں ۲۰۰ کروڑ کے معاملہ پر ہاتھ ڈال بیٹھے ہوتے ہیں یعنی جو بنک ۵۰ سال قبل ۵ یا ۱۰ کروڑ کے سرمایہ سے شروع ہوا تھا وہ اب ۳۰۰ کروڑ منافع حصہ داران کو تقسیم کرتا ہے اور ۲۰۰ کروڑ کا سرمایہ محفوظ رکھتا ہے۔

چنانچہ ہسپانیہ کے بنکوں کے منافع کا نقشہ حسب ذیل ہے:-

	بنیادی سال	سرمایہ ابتدائی	محفوظ سرمایہ	منافع تقسیم شدہ	آخری سال
بنک بلباؤ	سنہ ۱۸۵۷ء	۲ کروڑ	۳۰ کروڑ	۵۴ کروڑ	سنہ ۱۹۵۳ء
بنک ہسپانو امریکانو	سنہ ۱۹۰۰ء	۱ کروڑ	۲۴ کروڑ	۵۷ کروڑ	سنہ ۱۹۰۰ء
بنک اسپانول	سنہ ۱۹۰۲ء	۲ کروڑ	۳۲ کروڑ	۵۶ کروڑ	سنہ ۱۹۵۳ء

منافع کی یہ تعداد سود کی خوابی تصویر ہے لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ سود دن اور رات بڑھتا ہے۔ صبح و شام بڑھتا ہے اور ہر گھڑی اور ہر پل پھیلتا اور پھولتا ہے اور بڑی بڑی متمول قومیں باوجود سونے و چاندی کے کافی مقدار یا سٹاک میں موجود ہونے کے اور زرِ مبادلہ کی کثرت کے، پھر سود کی وجہ سے ان کے اقتصادی نظام کی شکل ایسی مسخ ہوگئی ہے کہ دیکھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۵۳ء کو ملک اٹلی کی پارلیمنٹ میں تحقیقات پیش ہوئی تو پتہ چلا کہ ۸۷۰،۰۰۰ خاندان ایسے ہیں جو گوشت، چینی اور شراب سے محروم ہیں۔ ۲۳۲،۰۰۰ کنبہ جات گوداموں، کوٹھڑیوں اور بیٹھکوں میں رہائش پذیر ہیں۔ ۲،۰۰۰ خاندان غاروں اور جھونپڑیوں میں پناہ گزین ہیں۔ ۱۰۷۰۰۰۰ خاندانوں کے ایک کمرہ میں چار افراد اور اس سے زیادہ سوتے ہیں۔

امریکن مزدور فیڈریشن کا کہنا ہے کہ نوکروڑ شمالی امریکہ کے مزدوروں کے لئے قانون و قواعد کے مطابق مکانات میسر نہیں اور نہ ہی وہاں صحت، صفائی کا حال عمدہ ہے۔

پیرس شہر کے نواح اور مضافات میں ۳۵۰۰۰ جھونپڑیاں ہیں جہاں لوگ رات کو سوتے اور دن کو گذارا کرتے ہیں۔ اگر سود کی لعنت میں یہ قومیں گرفتار نہ ہوتیں یا قرضہ دینے والے بنک اور حصہ داران بنک بلا سود قرضہ دیتے تو ان متمدن ملکوں اور متموّل قوموں کی حالت کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔ وہ ۲۵ سال میں تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے اصل زر ادا کرنے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتیں اور آزادی کا سانس لیتیں اور حکومت بھی کاروبار قبل از جنگ کے پیمانے پر لانے میں کامیاب ہوتی۔ لوگوں کو سہولت حاصل ہوتی۔ قیمت کم ہوتی۔ اشیاء ارزاں ملتیں۔ پیداوار کی کثرت سے بیرونی تجارت بڑھ جاتی اور اس طرح ملک پھر ایک بار خوشحالی کا منہ دیکھ سکتا۔ مگر سود کے طفیل چند افراد تو خوب عیش کرتے ہیں لیکن قوم اور ملک مہنگائی، چور بازاری، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اخلاق میں پستی، ملکی ترقی میں تنزل کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ قومی معیار ایسا ذلیل ہو جاتا ہے کہ غیر قومیں ان کو دبا لیتی ہیں محکوم بنا لیتی ہیں۔ اور ان کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ بنک کے حصہ دار سرمایہ داری کے اصول کے تحت اپنے سرمایہ کو بڑے بڑے کاموں جیسے کانوں، کپڑے، چینی، روئی، سیمنٹ کی ملوں، ریلوے، ٹرانسپورٹ، جہازرانی، صنعتی کارخانوں تجارتی کمپنیوں اور انشورنس میں لگا کر اپنے اثر و رسوخ کا ایسا جال پھیلا دیتے ہیں جس کی زنجیریں ایک نقطۂ مرکزی یعنی سرمایہ اور بنک کے اندر آ کر جمع ہوتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ سرمایہ کی وجہ سے منافع کے علاوہ ان جماعتوں میں اپنے لاتعداد ڈائرکٹر، منیجر اور نگران ملازم رکھتے ہیں۔ جو نہ صرف ان کارخانوں سے تنخواہ وصول کرتے ہیں بلکہ باہمی مشاورت سے ایک دوسرے کی خرید و فروخت میں امداد کرتے ہیں، بھاؤ کو کنٹرول کرتے ہیں کسی دوسرے کو مقابلہ میں منڈی میں آنے نہیں دیتے اور آپس میں لین دین کرتے ہیں تاکہ تمام منافع روپیہ کی صورت میں ان کے بنک میں جمع ہو۔ چونکہ وہ مختلف تجارتی کاروبار پر چھائے ہوتے ہیں اسلئے بظاہر عوام کو دال میں کالا نظر نہیں آتا۔ گہرے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ تمام بڑے بڑے کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں ڈائرکٹروں کی فہرست میں بار بار وہی نام آئیں گے۔ انگلستان کے پانچ بڑے بنکوں کے قبضہ میں ۱۱۷۲ آسامیاں ڈائرکٹروں کی ہیں جن میں ۱۳۰، دوسرے بنکوں کی ۱۲۰ جہازرانی کی۔ ۲۵ انگریزی ریلوے کی۔ . . . . . .

. . . .

. . . . ۲۷ غیر ملکی۔ ۳۷ کانوں کی۔ ۹۷ پٹرول کمپنی کی۔ ۸ اسلحہ فیکٹریوں کی اور باقی دیگر اہم کاروبار کی۔ اس طرح جو رقوم بطور قرضہ حکومت یا عوام بنک سے لیتے ہیں وہ لوٹ پھر کر اسی بنک میں واپس آ جاتی ہیں۔ اور یہ دائرہ مکڑی کے جالے کی طرح مکھی کو بالکل اپنے اندر محبوس و مسدود کر لیتا ہے

حاصل بحث یہ ہے کہ بنک سُود کا اوّلین مظہر ہے اور سُود قرض کی پیداوار اور بچہ نہیں بلکہ سُود قرض کی ماں اور باپ ہے ۔ اگر بنک سود کی مقدار بڑھا دیتا ہے تو لوگ اپنا مال و زر سُود کی خاطر بنک کے حوالے کر دیتے ہیں ـــــ اگر بنک سُود کی مقدار گھٹاتا ہے تو لوگ قرض کے لئے لپک پڑتے ہیں ۔ گویا کہ روپیہ کی کثرت و قلّت یا سرمایہ کا تار چڑھاؤ کی کنجی سُود کی کمی اور بیشی ہے ۔ سُود دل کی مانند ہے اور سرمایہ نبض کی طرح اس کے گرد چکر لگاتا ہے ہر تعمیری پروگرام اور ہر دولت کی پیداوار کی سکیم کا انحصار قرضہ پر ہے ۔ اور قرض بلا سُود نہیں اور سُود وہ غربت کی پھٹکار ہے جو گھٹائے نہ بنے اور چھڑائے نہ چھٹے ۔

لارڈ لوئیڈ مور کا کہنا ہے کہ مالیاتی نظم و ضبط کی دنیا ایک علیحدہ مضبوط ریاست ہے جس پر حکومت کنٹرول نہیں کرتی ۔

اور پریذیڈنٹ گارفیلڈ کا قول ہے کہ وہ طبقہ جو ملک کے روپیہ اور مالی نظام کو قبضہ میں کئے ہوئے ہے وہی دراصل ملکی تجارت اور صنعت کا مالک ہے ۔

امریکہ جب انگریزوں سے جنگ آزادی لڑ رہا تھا تو اُس وقت **ابراہام لنکن** نے کہا تھا کہ میرے آگے لڑاکا فوج ہے اور میرے پیچھے سرمایہ دار کی قوت ۔ لیکن مجھے خوف صرف پچھلی قوت سے آتا ہے ۔

سی ۔ ایچ ڈگلس کہا کرتا تھا کہ بینکرز کی ہی ایسی قوم ہے جو دوسروں کو اپنے پاس سے بلا کچھ دیئے منافع پیدا کرتی ہے اور نیست سے ہست کا ثبوت دیتی ہے یعنی اپنا سرمایہ تو چند سالوں میں منافع کی صورت میں وصول کر کے باقی لوگوں کے سرمایہ سے کاروبار چلاتی ہے بڑی عمارتیں کھڑی کرتی ہے، کارخانوں کو چلاتی ہے، سونے چاندی میں کھیلتی ہے، عوام پر حکومت کرتی ہے، اور اپنے پاس سے کچھ نہیں دیتی ۔ یہ عجب !!!

راتھ چائیلڈ جس کو بین الاقوامی اقتصادیات کا باپ سمجھا جاتا ہے اس کا خیال ہے کہ اگر مالی نظم و ضبط اس کے حوالہ کر دیا جائے تو وہ حکومت کے قوانین سے بالکل بے پرواہ ہو گا ۔ یعنی اس کی دنیا کے دھاسے کے سامنے ملکی قوانین اثر انداز نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے کہ مالی تنگی قرضہ کو روک کر پیدا کی جا سکتی ہے جس سے عوام بے قرار ہو کر بغاوت کے مرتکب ہوتے ہیں اور حکومت کا تختہ پلٹ جاتا ہے ۔ گویا کہ سُود کی بدولت بحر و بر کا فساد برپا ہوا ہے، ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا ۔

موجودہ زمانہ کا قرضہ چونکہ سُودی ہے یہ قرض خود بخود بڑھتا رہتا ہے اور منافع پیدا کرتا ہے ۔ لُوسن گھاس اور برسیم کا چارہ کئی دفعہ کاٹنے کے باوجود پھر از سرِ نو پھلتا اور پھولتا ہے اور کاٹا جاتا ہے اور اس طرح سات مرتبہ تک ایک ہی دفعہ کا بویا ہوا کاٹا جا سکتا ہے ۔ لیکن سُود مسلسل نفع دیتا رہتا ہے اور اصل زر کی ادائیگی کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ مثال عرض ہے کہ انگلستان کا ۸۰ لاکھ پونڈ کا قرضہ سنہ ۱۸۰۰ء میں تھا جو سنہ ۱۹۱۴ء میں ۶۵ کروڑ پونڈ تک پہنچ چکا تھا ۔ اور سنہ ۱۹۵۳ء میں اسکی تعداد

۹۵۸ کروڑ تھی۔

اسی طرح شمالی امریکہ کا ملکی قرضہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ا کھرب ڈالر تھا جو سنہ ۱۹۵۲ء میں ۲۵ کھرب ڈالر تھا۔

ملک فرانس کا قرضہ تو سالانہ تیزی سے بڑھتا رہتا ہے وہاں سنہ ۱۹۵۳ء میں قرضہ ۲۵۷۴۰۰ کروڑ فرانک تھا۔ جس کے سالانہ سود کی ادائیگی سابقہ ۱۵ سالہ آمد کے برابر تھی۔

سُود کی آمد کا اندازہ مرکزی حکومت، صوبائی حکومت اور میونسپل کارپوریشن اور دیگر تجارتی اداروں کے قرضہ جات کے جاننے پر ہوتا ہے۔ جبکہ جہازرانی، بجلی، پانی، گیس، ٹیلیفون، بسیں اور زیرزمین ٹرانسپورٹ، تیل، کانوں کا تمام کاروبار قرضہ پر ہوتا ہے اور یہ قرض کروڑہا روپیہ تک پہنچتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ سُود کی رقم بھی اصل رقم تک جا پہنچتی ہے۔

یہ منافع بلا محنت اور خطرہ کے وصول ہوتے ہیں کیونکہ بنک صرف ایسے آسامیوں کو اُدھار دیتا ہے جن کے پاس ادائیگی کی خاص ضمانت ہوتی ہے، صاحبِ حیثیت ہوتے ہیں اور حکومت کا بار تو عوام پر منتقل ہو جاتا ہے اس لئے اندیشہ اور بھی کم ہوتا ہے۔ چونکہ روپیہ کا مالک بنک روپیہ کو روک کر یا بڑھا کر منافع پیدا کرتا ہے اسلئے بلا محنت کثیر رقم ہتھیا لیتا ہے کارخانہ دار، مزدور، زمیندار، انجنیر، تاجر محنت کرتے ہیں، کوشش سے مال اکٹھا کرتے ہیں، فصل کو منڈی میں لاتے ہیں تاکہ فروخت کر سکیں ان کے مال کی قیمت ان کی تمام محنت شاقہ اور عرق ریزی کا معاوضہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو فی الحقیقت صحیح دولت پیدا کرتے ہیں اور منافع کے مستحق ہیں مگر منڈی میں آنے کے بعد روپیہ صرف بینکر سے ملتا ہے جو قیمت کے گرانے اور بڑھانے کے لئے سُود کی کمی و بیشی سے منڈی کا بھاؤ نکالتا ہے اور جنس کو خرید کر سُود جمع کر کے ہر خریدار سے منافع وصول کرتا ہے۔ اور پیدا کرنے والا خود جب اپنی ضرورت کے لئے اپنی ہی پیداوار خریدنے آتا ہے تو پیدا کردہ قیمت سے بہت زیادہ ادا کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں اب سُود کی ملونی ہو چکی ہے۔ سُود بینکر کا وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ نسلِ انسانی سے اپنا منافع وصول کرتا ہے ہر چیز خواہ وہ کھانے کی ہو، پینے کی ہو، استعمال کی ہو یا جلانے کی۔ اس کی زد سے باہر نہیں۔ خواہ وہ حکومت مرکزی ہو یا صوبائی، کمیٹی ہو یا عوام۔ اگر یہ شبہ ہو کہ سُود تو امراء ادا کرتے ہیں یا مقروض اور باقی لوگ سود کی حکومت کے ماتحت نہیں آتے تو یہ بھی ایک خوش فہمی ہے۔ کیونکہ سُود ہر چیز میں اس کی قیمت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جو ہر خریدار کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ خواہ وہ خریدار غریب ہو یا مزدور ہی کیوں نہ ہو۔ خریداری میں بیوہ اور یتیم، بےکس اور بیمار سب یکساں ہیں۔ سود وہ کرچے کا غبار ہے جو انسان کے ہر عضو پر پڑتا ہے اور اسے گرد آلود کر دیتا ہے۔ آنکھ، کان، سر، چہرہ، ہاتھ، پاؤں اور جسم کا کوئی حصہ اس سے محفوظ نہیں رہتا۔ اسی طرح مشین کے ہر پُرزہ میں خلل دیتا ہے اور اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ گویا انسانی نظام کی اقتصادیات کے ہر پہلو میں داخل ہو چکا ہے اور غالب ہے۔

یہ وہ زہر ہے جس نے تمام صنعتی اور ایجادی ترقی کے مفاد کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔ زمانہ حال کو نئی ایجادات سائنسی ترقی کی روشنی میں بجائے خوشحالی کے بے چینی، مہنگائی

حاصل ہو رہی ہے اور عوام کی حالت بدتر ہو رہی ہے کیونکہ ملازمین کی تنخواہ کے بڑھنے کی صورت میں بھی ضروریات کی قیمتیں جب زیادہ ہوں تو بچت کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ اور بچت کے بغیر معیار زندگی اعلیٰ نہیں ہوتا۔ پیداوار کی قیمت اسلئے نہیں گر سکتی کہ اس پر ٹیکس، سود اور منافع کی کئی تہیں جمی ہوتی ہیں۔
اگر صبر سے کام لو چیز گم ورنہ قیمت خوفناک۔

شائی لاک کی تمثیل

ایک انگریز مصنف شیکسپیئر نے ڈرامہ لکھا کہ ایک یہودی جس کا نام شائی لاک تھا اس نے عدالت میں وینس کے تاجر کے خلاف دعویٰ کیا کہ وہ اس کا مقروض ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں معاہدہ یہ تھا کہ "شائی لاک تاجر کا ایک پونڈ وزنی گوشت جسم سے کاٹنے کا حقدار ہوگا"۔ چونکہ وہ ایفائے وعدہ نہیں کر سکا اس لئے عدالت اُسے گوشت کاٹنے کا حق دے۔
شائی لاک کا حق ثابت تھا مگر عدالت و دیگر حاضرین نے شائی لاک کو نیکی و رحم اور ہمدردی کی ترغیب دے کر چاہا کہ وہ گوشت کاٹنے کا مطالبہ ترک کر دے مگر وہ مُصر رہا۔
چنانچہ عدالت کو فیصلہ قارض کے حق میں دینا پڑا مگر انسانی گوشت کاٹنے کی شرط کے لئے عدالت نے ڈگری دار پر واضح کیا کہ معاہدہ میں خون کا ذکر نہیں اور خون گرانا جرم ہے۔ اس لئے مدیون کا گوشت ایک پونڈ بلا خون نکالے کاٹ لیا جائے۔ یہ امر بظاہر ناممکن تھا۔ عدالت برخاست ہوگئی حاضرین مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ تاجر دکان پر جا پہنچا اور شائی لاک اس وصولی کی فکر میں تھا۔ کیونکہ وہ قانونی لحاظ سے کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کو چند سکوں کے بدلے انسانی گوشت کاٹنے کا حق دیدیا گیا تھا۔ انسان کی حیثیت معمولی قیمت کے عوض فروخت کر دی گئی تھی۔ زر آج انسانیت پر غالب آگیا تھا۔ اور اشرف المخلوقات کا نمونہ قلیل تعداد پیسوں کے مقابلہ میں ہار چکا تھا۔ شائی لاک نے ایک پونڈ گوشت کی بجائے تمام انسانی جسم کا گوشت اور ایک قطرہ خون کے عوض بلا خون گرائے تمام سُرخ خون اور تمام کا تمام نیلگوں خون سُود کی شکل میں انسان سے وصول کیا۔
انسان نے بخوشی یہ قربانی دینا شروع کی۔ اور نہ صرف خوشی سے بلکہ اس پر فخر کرنے لگا۔ اب شائی لاک کو تاجر کے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہ رہی کہ مقروض کے لئے عدالت میں جائے بلکہ خود مقروض دست بستہ اسکے دروازہ پر دستک دے۔ اصل زر کی ضمانت دے اور اپنا خون اور گوشت پیش کر دے۔ چنانچہ آج بھی ملک اٹلی کے وینس شہر میں شاہراہ آرٹی کے پُل ریالٹو نامی کے سامنے ایک سائن بورڈ لگا ہے جہاں شائی لاک کا گھر تھا کہ "یہ شائی لاک کا گھر ہے"۔ اب جگہ جگہ، شہر شہر شائی لاک کا گھر تعمیر ہو چکا ہے۔ بنک کھُل چکے ہیں۔ جہاں سُودی کاروبار زوروں پر ہے۔ دن رات ہوتا ہے۔ آٹھوں پہر چلتا ہے اور تاجر اور صنّاع، امراء اور وزراء اس کا طواف کرتے اور احترام سے آداب عرض بجا لاتے ہیں۔
ہے تو ایک لطیفہ۔ کہ ایک گاؤں کے چڑیا گھر میں دو شیر رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ مگر پہلا شیر بوڑھا ہو چکا تھا اور دوسرا نوجوان ہدیہ میں آیا تھا۔ یہ سارا دن غراتا تھا، دہاڑتا تھا، کودتا تھا اور لوگوں کو اپنی شان و شوکت، رعب و ہیبت سے مرعوب کر رکھا تھا اور بوڑھا شیر سارا دن سوتا تھا اور کروٹ بدلنے سے بھی گریز کرتا تھا لیکن

جب شام ہوئی تو چڑیا گھر کے خادم نے بوڑھے شیر کو گوشت کا بہت بڑا ٹکڑا دیا جس کو وہ کھانے لگا اور چھوٹے شیر کو اس نے کچھ کیلے، مونگ پھلی، پھلیاں، چنے اور اخروٹ ڈال دیئے۔ اس نے حیرت سے بوڑھے شیر سے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے بتایا کہ چونکہ اس دنیا میں تمہاری گنجائش نہیں اسلئے تمہیں بطور بندر یہاں رکھا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی صورت اہل یہود کی ہے۔ وہ دنیا کی تمام تمار کو اپنے لئے تصور کرتے ہیں اور باقی دنیا کو بندر سمجھتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور سزا بندر فرمایا۔ جس طرح آزادی میں بندر درخت درخت اور جنگل جنگل پھرتا ہے اور اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا اور جب پابند ہو تو مداری کے اشارے پر ناچتا ہے۔ اٹھتا ہے اور بیٹھتا ہے اور بیٹھتا ہے۔ اور ہر طرح کی غلامی قبول کر لیتا ہے۔

تورات میں یہود کو ہدایت تھی کہ وہ اپنے بھائی سے سُود نہ لیں اور نہ اُنہیں غلام بنائیں۔ اوّل تو انہوں نے بھائی سے سُود نہ لینے سے مطلب یہ نکالا کہ باقی قوموں سے ضرور لیں۔ اور جب باقی قوموں کے سُود سے مال و زر کی فراوانی نظر آئی تو اپنے لوگوں سے بھی سُود لینا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قرض اور سُود ادا نہ کر سکتا وہ یا تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاتا اور یا پھر سُود خور کا غلام بن جاتا اور یہ دونوں باتیں یہود کے لئے ممنوع تھیں۔ اس لئے ان کو ان اعمال کی سزا (یعنی ردِّ عمل) یہ ملی کہ ان کو کبھی مستقل گھر یا ملک نہ مل سکا اور جہاں بھی وہ گئے وہ غلام بنائے گئے۔ اور ہر قسم کی ذلّت ان پر سوار رہی۔ چنانچہ الجزائر میں یہودیوں کو الجیفہ ابن الجیفہ یعنی مُردار اور پسر مُردار کے الفاظ سے خطاب کرتے ہیں اور یہود کو اجازت نہیں کہ وہ کسی مسلمان یا اس کے بچہ کو مقابل میں مار سکیں۔ البتہ وہ منّت خوشامد یا بھاگ کر رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلمان کو مارنے کی صورت میں سزا اسے قید اور قتل ہے۔

یہ قوم سخت حریص اور کنجوس ہے۔ آبائی پیشہ اور عادات کے لحاظ سے اس قدر پختہ اور مستقل مزاج ہے کہ اس کی مثال دوسری اقوام میں نہیں ملتی۔

بائیبل میں لکھا ہے کہ "جب موسیٰؑ کوہِ طور پہ آئے تو یہود نے قوم کے زیورات سے سونے کا بچھڑا تیار کر کے اُسے معبود قرار دے لیا جس پر خدا کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہوا۔"

اقتصادی لحاظ سے اس تنبیہہ سے یہ مراد تھی کہ سونے چاندی کی اصل غرض گردش کرتا ہے جس سے ساری قوم فائدہ اٹھائے اور مال و زر کو بند رکھ کر چند کاہنوں یا پجاریوں کا روپیہ کمانا معیوب بات ہے۔ سود خور اور بنک روپیہ کو جمع رکھ کر سُود کماتا ہے اور بنک کے حصّہ دار جو تعداد میں چند ہوتے ہیں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اس کی دوسری کیفیت عہد نامہ قدیم میں یوں بیان ہوئی ہے کہ "سانپ نے حوّا کو ممنوعہ پھل کی تحریص دلائی کہ اس کے فوائد بے شمار ہیں اور آدم کو بھی ممنوعہ پھل سے کھلایا۔ اس بھُول کی سزا میں حوّا کو کہا گیا کہ سانپ تیری اور تیری نسل کی ایڑی کو کاٹے گا اور وہ اس کا سر کچلے گی اور تُو درد سے اولاد جنے گی۔ اور آدم کو کہا کہ تُو اپنے پسینہ کی کمائی سے کھائے گا اور زمین تیرے لئے کافی نہ ہو سکے گی۔ اور سانپ پیٹ کے بل

چلے گا اور مٹی چاٹے گا۔"

سانپ نے یہود کی شکل اختیار کی جو سُود کے ذریعہ نسلِ انسانی کو کاٹتا ہے جس کی وجہ سے اکثر جنگیں ظہور میں آئیں اور یہود کو در بدر دھکے کھانے پڑے اور گزشتہ جنگ میں تو ساٹھ لاکھ یہود نازی مظالم کی نذر ہوا۔ ایڑی سے مراد پیچھے سے، خفیہ طور پر، خاموشی سے ہے۔ سُود کی معمولی تعداد، قرض کی ضرورت اور اہمیت کے بالمقابل بظاہر اپنی تباہی کو ڈھانپے رکھتی ہے اور ایڑی جس کے ذریعہ انسان چلتا پھرتا ہے یعنی طاقت حاصل کرتا ہے، روزی کماتا ہے، تلاشِ رزق کرتا ہے، اس کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کو مقروض بنا کر دیوالیہ، بھوکا اور فقیر بنا دیتا ہے۔ سُود کے بوجھ تلے نہ صرف دوسری قومیں دردِ میں مبتلا ہوتی ہیں۔ بلکہ جب ایک نسل سے سود و قرض ادا نہیں ہوتا تو دوسری نسل اس وراثت کو کندھا دیتی ہے گویا درد نہ صرف ایک قوم کو ہوتا ہے بلکہ اس درد میں اس کی آئندہ اولاد بھی شرکت کرتی ہے اور آدمی کسان، مزدور، صناع، کارخانہ دار، تاجر سب لوگ خوب محنت کرتے ہیں۔ خون اور پسینہ بہاتے ہیں مگر سُود اور قرض اُن کی سب کمائی ہضم کر جاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا جاتا ہے۔ اور یہود خود پیٹ کے بل زمین پر چلتا ہے یعنی اسی ذریعۂ معاش (قرض اور سُود) کے بل پر گذر اوقات کرتا ہے۔ اس کا یہی پیشہ ہے اور جس جگہ جاتا ہے اُس زمین اور اہلِ ارض کو چاٹ جاتا ہے، اُن کو کمزور کرتا ہے، اُن کی مالی حالت خراب کرتا ہے اور اقتصادی نظام میں گھُن کے کیڑے کی طرح گھُس جاتا ہے جو بعدہٗ بہت خون خرابہ کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اس قوم کو جلا وطن کرنے یا لُوٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے واضح طور پر سُود کو چھوڑنے کی تاکید فرمائی اور بتایا کہ ورنہ جنگ کے لئے تیار رہو۔

گزشتہ تمام جنگوں کا تجزیہ کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ فریقین میں جنگ و جدال کی ہمت نہ تھی مگر قرضہ کی امید اور آسانی نے جو سُود پر ہر وقت دستیاب ہو سکتا تھا ان میں انسانی جانوں کا سٹہ کھیلنے کی جرأت پیدا کر دی۔ ورنہ اس مالی اور جانی نقصان کے پیشِ نظر جو جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا آئندہ سَو سال نہیں تو کم از کم پچاس سال تک تو لڑائی کا خیال نہیں آ سکتا تھا مگر دوسری عالمگیر جنگ ستمبر ۱۹۲۳ء میں شروع ہوئی یعنی ۲۵ سال بعد۔ اور وہ تباہی آئی جس کے خیال سے آئندہ جنگ نہ ہونے کے امکانات پیدا ہوئے۔ مگر ابھی ۲۵ سال پورے نہیں ہو پائے کہ فضائے دنیا پر پھر ایک بار جنگ و جدل کے بادل جمع ہو رہے ہیں۔ کیونکہ سُود کے زبردست ہاتھ، سُود کے مکروہ نتیجہ اور گندے نتائج کی بدولت زرِ دنیا زمین کے کناروں پر چند لوگوں اور مخصوص قوموں کے ہاتھ میں جمع ہو گیا ہے اور خوفناک آگ کے شعلے سلگتے نظر آتے ہیں اور کسی دم یہ زلزلہ یا سیلاب دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے معلوم دیتا ہے۔

ماہرینِ اقتصادیات کی آراء

مشہور پروفیسر ہانس ہیمن کہتے ہیں کہ ہمیں ایسے اقتصادی نظام کو جو آئے دن آفات، مصائب اور حادثات کا موجب ہو رہا ہے انقلاب اور جنگ کو ہوا دیتا ہے،

تبدیل کرنا چاہیئے کیونکہ اس نظام کی فلاسفی یا علت یا غرض و غایت ہی یہ ہے کہ وہ انسان پر حکومت کرے لیکن ہمیں کوشش کرکے اقتصادی نظام کو انسانی خدمت پر لگانا چاہیئے اور اس کے لئے ہمیں مسلسل محنت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

میکنزی کنگ جو کینیڈا کی حکومت کے وزیر اعلےٰ رہے ہیں لکھتے ہیں کہ جمہوریت کا دعویٰ فضول ہے۔ آزاد حکومت اور پارلیمنٹ بیکار ہیں۔ جب تک یہ بنکوں کے حصہ دار چند لوگ جو ذاتی مفاد کی خاطر روپیہ اور قرض کو قابو کئے ہوئے ہیں۔ اس نظام کو قوم کے حوالہ نہیں کر دیتے۔

ماہر اقتصادیات ایل ایون تو یہاں تک پکار اٹھے کہ حکومت فقیر اور بے کس ہے۔ کارخانہ دار اور تاجر بھی فقیر ہے۔ اور قوم بھی بھوکی اور فقیر ہے۔ کیونکہ ان سب کو اپنا حق زندگی حاصل کرنے کے لئے بنک کے دروازہ پر دستک دینا پڑتی ہے۔

بنک کا طریق کار

تمام پرائیویٹ بنک ایک نظامیہ لڑی میں منسلک ہیں۔ جن کا محور ایک مرکزی بنک ہے۔ جو خزانہ سرکار کا معاون و نمائندہ ہے۔ یہ مرکزی بنک کاغذی کرنسی یعنی نوٹ جاری کرتا ہے اور ملکی کرنسی باقی بنکوں کو مہیا کرتا ہے۔ گو ملکیت کی ذمہ داری خزانہ سرکار پر ہے لیکن نوٹ کی تیاری، بناوٹ، شکل، صورت، مقدار اور تعداد سب مرکزی بنک کے سپرد ہے۔ ہر ایک بنک ضمانت۔ سونا، چاندی دے کر جس قدر نوٹ کی اس کو ضرورت ہے مرکزی بنک سے حاصل کر سکتا ہے اور اپنے تمام سرمایہ کی بنیاد پر قانون کے دیئے ہوئے حق اضافہ کے مطابق کاروبار کرکے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

مثلاً گورنمنٹ نے ایک نہر نکالنے کا ارادہ کیا ہے یا ریل جاری کرنے کا پروگرام ہے اور اس کا اندازہ ۱۰۰ کروڑ روپیہ کی لاگت ہے تو خزانہ سرکار فقط ایک پرچی بنک کو روانہ کرے گا کہ ۱۰۰ کروڑ قرضہ بشرح ۳ یا ۴ فیصدی سود لے گا۔ اب یہ بنک اپنی ضرورت کے مطابق جس قدر نوٹ چاہتا ہے مرکزی بنک کو ضمانت دے کر لے سکتا ہے ورنہ فی الحال اس کے پاس اپنا ذخیرہ کافی ہے۔ بنک صرف اپنے کھاتہ کی کتاب میں گورنمنٹ کے نام ۱۰۰ کروڑ روپیہ جمع کرے گا اور دوسرے صفحہ پر حساب کھولے گا۔ جس میں بنک قارض اور سرکار مقروض ہو گی۔ قرضہ ۱۰۰ کروڑ روپیہ۔ تاکہ سود بالشرح باقاعدہ جمع ہوتا رہے۔ چیک کی وصولی کے دن سے قرض پر سود شمار ہوتا ہے۔ اس وقت تک بنک نے نہ تو کوئی نوٹ اور نہ سکہ گورنمنٹ کو دیا ہے صرف کاغذی ہیر پھیر سے سود کا مستحق ہو گیا ہے۔

اب ریلوے کی تعمیر کے لئے ۱۰ ٹھیکیدار ۱۰ کروڑ روپیہ کے کام کا ٹھیکہ دیتے ہیں اور گورنمنٹ ان کو ایک کروڑ روپیہ کام شروع کرنے کے لئے پیشگی دیتی ہے۔ یعنی جو چیک بک گورنمنٹ کو روپیہ بنک سے لینے کی ملی ہے۔ اس میں سے گورنمنٹ ۱۰ چیک ایک کروڑ روپیہ فی چیک ہر ٹھیکیدار کے حوالہ کرتی ہے۔ اور اس قدر رقم ٹھیکیدار نہ اٹھا سکتا ہے اور نہ فوری طور پر مصرف میں لا سکتا ہے۔ وہ فوراً بنک میں اپنا حساب کھولتا ہے۔ چنانچہ اس کے نام کا ایک کھاتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور

اس میں ایک کروڑ روپیہ جمع کا اندراج ہوجاتا ہے ۔ اس طرح دس حساب اور کھل جاتے ہیں۔ ایک ہی بنک یا مختلف بنک ہونے سے فرق کچھ نہیں پڑتا۔ علیٰ ہذا القیاس ہزاروں لاکھوں کی رقوم کے حساب یکے بعد دیگرے کھلتے چلے جاتے ہیں اور بنک اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ سب کام کلرک اور رجسٹر کر رہے ہیں۔ کام شروع ہونے پر سینکڑوں کی نقدی تقسیم کرنے کے لئے یا فوری ادائیگی کے لئے درکار ہوتی ہے۔ وہ نقدی کی صورت میں چیک کے ذریعہ سے بنک سے حاصل کر لی جاتی ہے ۔ یہ نقدی اگر الف کو ایک کھڑکی سے ادا ہو رہی ہوتی ہے تو دوسری کھڑکی سے عوام اس سے کہیں زیادہ رقوم بنک میں اپنے ذاتی حسابات یا دوسرے حسابات میں جمع کرا رہے ہوتے ہیں لیکن بنک کو بحیثیت ادارہ کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ یہ یاد رہے کہ ۱۰۰ کروڑ قرضہ حکومت پر سُود برابر لگ رہا ہے ۔

صرف ایک اسی مثال کو مدنظر رکھیں تو بنک کو ۱۰۰ کروڑ قرضہ کی بنا پر اور دس حسابات دس دس کروڑ یعنی ۱۰۰ کروڑ کی مالیت پر کُل ۲۰۰ کروڑ پر بآسانی تین گنا یعنی ۶۰۰ کروڑ کاروبار اور قرضہ دے کر منافع کی حیثیت قانون کے ذریعہ حاصل ہو چکی ہے ۔ مزید برآں جو لاکھوں کے حسابات کھلے ہیں اور جو روزانہ نقدی وصول ہوتی ہے اس کی کُل حاصل جمع پر پھر تین گنا قوت مل جاتی ہے۔ محض کتابوں میں زیادہ سے زیادہ ہندسوں کو جوڑ دیا جاتا ہے اور بنک کی کُل کائنات چند رجسٹر اور چند کلرک کروڑہا روپیہ بمد سود جمع کر لیتے ہیں اور اپنی گرہ سے ایک پائی صرف نہیں کرتے ۔

اور جب چیک مختلف بنکوں میں جمع ہوں تب بھی نقد ادائیگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ششماہی یا سالانہ پھر ایک مرکزی بنک پڑتال کر کے ہر ایک بنک کا علیحدہ علیحدہ حساب لین دین وضع کر دیتا ہے ۔ اور ہر بنک کے کھاتہ جات میں بنکوں کی جمع اور نام رقومات ہو جاتی ہیں ۔ مگر روپیہ ، نوٹ ، سونا یا چاندی کا کچھ لین دین نہیں ہوتا ۔ بنک نیست سے دولت پیدا کرتا ہے۔ غور کریں تو پتہ چلے گا کہ روپیہ آیا کہاں سے ۔ حکومت نے ایک خط دیا ، بنک نے حساب کھول دیا ۔ لوگوں کو چیک دیئے گئے اور ان کا اندراج کتابوں میں کر دیا اور کروڑوں روپیہ کا کاروبار ہو گیا اور سُود کی آمد مفت میں ملی ۔ اور آخری مرحلہ پر جب نقد دیا تو اس سے کہیں زیادہ عوام نے مزید داخل کیا۔

اس سے یہ نتیجہ ناگزیر ہو گیا کہ بنک روپیہ مہیا نہیں کرتا ہے ۔ لوگوں کی امداد نہیں کرتا بلکہ قرض بنانے کا ادارہ ہے اور زیادہ سے زیادہ قرض پیدا کرتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ سود اور نفع حاصل کرے ۔ بنک کو نقد روپیہ یا نوٹ ، چاندی اور سونا بھی جمع رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یک وقت کبھی بھی اتنا مطالبہ نہیں ہوتا کہ بنک روزانہ اور اپنے معمولی اندرونی سرمایہ سے اس کو پورا نہ کر سکے ۔ ہنگامی صورت میں بنک دوسرے بنکوں سے یا مرکزی بنک سے فوراً طلب کر سکتا ہے ۔ اور یہ امداد کبھی روکی نہیں جاتی ۔

اور جب یہ کام ریلوے کا تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو تمام قرضہ معہ سُود حکومت محکمہ ریلوے پر منتقل کر دیتی ہے

اور یہ بار اس طرح قوم کے سر سوار ہو جاتا ہے اور لوگ کرایہ کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں دولت پیدا کرنے والے اور تعمیری کام سرانجام دینے والے قارض نہیں بلکہ مقروض ہیں۔ مالک نہیں، غلام ہیں اور بنک ساہوکار ہے جس کا مطلب شاہکار لیا جاتا ہے جو کہ دراصل سیاہ کار ہونا چاہیئے۔ اور حکومت اس مشینری میں محض ایک پُرزہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ بنک دن بدن اپنے ہاتھ لمبے کرتا جاتا ہے اور ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں اپنی شاخیں قائم کرتا ہے اور اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر جو اس نے مختلف ملوں، فیکٹریوں اور کارخانوں، کانوں، ریلوں، بسوں، بجلی، گیس، پانی، ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ کے کاروبار میں لگا رکھا ہے۔ اور آگے ان کی شاخیں جگہ جگہ کام کر رہی ہیں جو ایک دوسرے کا مال آپس میں خرید کرتی ہیں اور تمام مالی کاروبار پھر کر اپنے بنک میں لوٹ آتا ہے اور اندرونی اور بیرونی شاخیں اسی لئے پھیلا رکھی ہیں کہ کسی جگہ بھی مالی کاروبار اپنے بنک کی دسترس سے باہر نہ ہو۔ جب یہ جال ملکوں میں پھیل جاتا ہے اور کام معمول پر آ جاتا ہے تو حضرات اُن کی نظر ملکی اور اندرونی حکومت سے بڑھ کر غیر ملکی شہنشاہیت پر پڑتی ہے اور اس طرح سے بنک کی سلطنت کی حدود ایک ملک اور براعظم سے بڑھ کر دُور دراز ملکوں تک جا پہنچتی ہے جن کو بعد میں تابع ملک یا کالونی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ سرمایہ کی طاقت بہت بڑی سلطنت کو جنم دیتی ہے۔ انگریز ہندوستان میں اسی سرنگ کے رستہ داخل ہوا! اور ۲۰۰ سال تک ہندوستان پر حکمران رہا۔

یہ قرض اور سُود سرمایہ کے دو بازو ہیں جو جہانگیری اور جہانبانی کی ہوس کو ہوا دیتے ہیں جس طرح سطح پانی پر ایک معمولی کنکری سے پیدا ہونے والی لہریں پہلے چھوٹے چھوٹے دائرے بناتی ہیں اور پھر بڑے بڑے حتیٰ کہ وہ دائرہ تمام سطح پر محیط ہو جاتا ہے۔ یا برص کا ایک داغ رفتہ رفتہ تمام جسم انسانی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اسی طرح سُود چپکے چپکے زہر چکانی کرتا ہے اور اچانک اپنے شکار کو دبوچ کر بے بس کر دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں غالباً ۱۸۷۵ء کا واقعہ ہے کہ خدیو مصر مقروض ہو گیا اور اس کو چالیس لاکھ پونڈ سکہ سونا کی ضرورت تھی۔ یہ افواہ اس وقت لندن میں پہنچی۔ جب صرف دو روز باقی تھے وزیراعظم انگلستان یہودی تھا۔ خدیو مصر نہر سویز کے حصے فروخت کر رہا تھا جس سے انگلستان کی بحری تجارت کو بہت فروغ حاصل ہو سکتا تھا۔ ڈزرائیلی نے موم بتی کی روشنی میں وزارت کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور منظوری حاصل کی مگر رقم کی فراہمی اس قدر جلد آسان نہ تھی۔ اس کی نظر اپنے یہودی دوست راتھ چائلڈ پر پڑی اور فوراً اس نے اپنے سیکرٹری کو بھیجا کہ چالیس لاکھ پونڈ مصر روانہ کرو اور حکومت برطانیہ اس کی ذمہ دار اور ضامن ہوگی۔ وقت معیّنہ کے اندر یہ رقم مصر پہنچ گئی۔ انگلستان کو حصص مل گئے۔ جس سے انگلستان کے لئے تجارت کے راستے مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں فتوحات کا راستہ کھل گیا حتیٰ کہ وہ دن آیا کہ سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔

واہ رے قرض اور سُود تیرے کرشمے!

بنک کی اس تنظیم کے سامنے چھوٹی صنعت اور معمولی سرمایہ داری کیسے مقابلہ کر سکتی ہے اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس لئے یا تو وہ بنک کی ضروریات اور خواہشات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے اور یا پھر گھٹتے گھٹتے دم توڑ دیتی ہے۔

ان حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے بسا اوقات جیسا کہ امریکہ میں ہے حکومت کو خاص اختیارات استعمال کر کے بنک کی اس بے پناہ قوت کو قانونی زنجیر سے روکنا پڑتا ہے۔ تاکہ تجارت کا قدرتی نشیب و فراز چند افراد کی تنگ نظری کا شکار ہو کر ملک کی اقتصادی حالت کو درہم برہم نہ کر دے۔

تلوار کا زخم مندمل ہو جاتا ہے مگر سود کا زخم رستا رہتا ہے اور بار بار تازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ریلوے کو لے لیجئے۔ ایک کمپنی سود پر قرضہ لیکر ریلوے چلاتی ہے۔ قرض اور سود ادا کرتی ہے مگر اس سروس کو جاری رکھنے کے لئے ایک مدت کے بعد گاڑیاں انجن اور سڑک کی تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے جس کے لئے مزید قرض لینا پڑتا ہے اور ادائیگی کے لئے زیادہ آمد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کرایہ بڑھایا جاتا ہے، باربرداری کی فیس بڑھائی جاتی ہے، سہولتیں کم کر دی جاتی ہیں اور آخری حربہ فروخت حصص کر کے بڑی بڑی رقوم حاصل کی جاتی ہیں۔ اور یہاں تک بھی حکومت سے کروا لیا جاتا ہے کہ موٹر اور بس سروس جو ریلوے سے مقابلہ کر رہی ہوتی ہے اس کو روک دیا جاتا ہے، کم کر دیا جاتا ہے اور ایسی کڑی شرائط عائد کی جاتی ہیں جن سے وہ بند ہو جاتی ہیں۔

لیکن زیادہ منافع کی حرص پوری نہیں ہوتی۔ تب یہ کمپنی حکومت یعنی قوم کو دھمکانا شروع کر دیتی ہے کہ وہ ریلوے بند کر دیں گے۔ ایسی اہم سروس کا بند ہونا گویا حکومت کے منہ پر چپت رسید کرنا ہے۔ حکومت ریلوے کو سنبھالنے کا اور خود قبضہ کرنے کا اعلان کر دیتی ہے۔ یعنی ریلوے کو قومیا لیا جاتا ہے یعنی سرمایہ قومی میں لے لیا جاتا ہے۔ مگر یہ اتنا آسان کام نہیں۔ مرمت، تعمیر اور قرض کا پہاڑ سامنے آتش فشانی کرتا نظر آتا ہے لیکن قہر درویش بر جان درویش حکومت "نمائندہ عوام" ریلوے کو چلانا شروع کرتی ہے۔ تعمیر اور مرمت کے لئے مزید قرضہ برداشت کیا جاتا ہے۔ اور روپیہ کی فراہمی کے لئے کرایہ اور ٹیکس میں اضافہ، اجرت باربرداری میں اضافہ، اخراجات میں کمی اور حصص کی خرید و فروخت کے باوجود اور آمد کے لگاتار ہونے کے باوجود کاروبار میں چمک پیدا نہیں ہوتی اور خسارہ کا میزان دن بدن بڑھ رہا ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ سود اپنی پوری شان سے پروان چڑھ رہا ہوتا ہے۔ آخر حکومت اس قومی ملکیت سے بیزار ہو جاتی ہے اور عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ واپس یہ سروس اسی کمپنی کے حوالے کر دیتی ہے کہ وہ دوبارہ اسے چالو کرے اور یہ کام یعنی تعمیر اہرام مصر از سر نو شروع ہوتا ہے اور عوام اس بوجھ تلے زیادہ سے زیادہ دبتے چلے جاتے ہیں اور یہ چکر سالوں سال چلتا رہتا ہے، سود کا چراغ جلتا رہتا ہے اور اصل زر کا تیل اسی طرح ساکن رہتا ہے۔ سود کا اصل چہرہ بنک کے آئینہ میں نظر آ سکتا ہے جس کی چمک دمک کے سامنے حکومت کا کاروبار، پرائیویٹ تجارت، صنعت،

پیشہ ور، کارخانہ جات سب گرہن زدہ ہیں۔

اس بلائے بیہودہ نے جو عام راہ گیر پر تاثر پیدا کیا ہے وہ کتنا دردناک ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان حالات میں امن کی خواہش یا امن کا قیام گویا موت یا خودکشی کے مترادف ہے کیونکہ اس سے بیکاری بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ جنگ کی صورت میں کاروبار لامحالہ ملتا رہے گا اور روزی کا ذریعہ بنا رہے گا۔ ورنہ فوجی نظام کو کم کرنا اور توڑنے میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن سے خطرہ ہے کہ اقتصادی نظام یک لخت نہ بیٹھ جائے۔ آجکل کے مغربی تعلیم یافتہ اس مسئلہ کو کاروبار کا جزو لازم تصور کرتے ہیں اور مالی حالت کے سُدھارنے کے ایسے ذرائع سوچتے ہیں جن سے جتنا سرمایہ آتا ہے وہ سُود کے سوراخ سے اسی طرح نکل جاتا ہے جس طرح چھانی سے پانی۔

لیکن یہ کیا راز ہے کہ حکومت اس قرضہ کو کم کرنے اور سُود کو بند کرنے کی بجائے سُود ادا کرنے اور اقتصادی حالت کو سال بسال دگرگوں ہونے دیتی ہے اور روک تھام کی طرف توجہ نہیں دیتی؟

یہ بھی ایک معمہ ہے کہ کیوں غیر متبدل کرنسی یعنی نوٹ جن کے لئے سونا، چاندی، نقدی ضروری نہ ہو ایسی ضمانت پر کام میں نہیں لاتی۔ تاکہ بنک والوں سے قرض اور سُود کی نوبت نہ آئے اور اس بھید کا بھی تا حال افشار نہیں ہوا کہ حکومت کیوں قدرتی ذخائر، دفینہ اور سب سے بڑھ کر قومی اور ملکی ساکھ کو بروئے کار نہیں لاتی جب کہ وہ ہزاروں انسانوں کو بھوکے، ننگے اور بے در دیکھتی ہے اور یا آخر کیوں وہ انسانیت کو چند افراد کے مفاد پر ترجیح دینے کو تیار نہیں ہوتی۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ بنک وہی روپیہ جو قوم بنک میں بلا سُود کے جمع کراتی ہے۔ وہی روپیہ بنک ایک زمیندار، کارخانہ دار اور تاجر کو زیادہ شرح سُود پر دیتا ہے آخر کیوں؟ اس لئے جب ایسے ادارہ کو قومی قبضہ میں لیا جائے تو فوراً سُود بند۔ اور اصل زر کا متعین حساب رکھ کر جس قدر ادائیگی ہو چکی ہو اس کو اصل زر شمار کر کے حساب چکتا کیا جائے تب کہیں نجات ہو سکتی ہے۔ برطانیہ اور فرانس میں قومی قبضہ یا ملکیت کی صورت میں ہمیشہ یہی طریقہ استعمال ہوتا ہے اور ریلوے کی سابقہ مثال سے واضح ہے کہ حکومت اور لوگ چند افراد کے سامنے بے دست و پا ہیں۔

سُود اور تجارت میں فرق

یاد رہے کہ بنک کے سُود کے جواز میں یہ کہتے کہ جس طرح گندم کا بیوپاری، کپڑے کا سوداگر، بُوٹ کا دکاندار اور موٹر کا ایجنٹ اپنا مال فروخت کر کے منافع پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح بنک روپیہ کا لین دین کر کے نفع بشکل سُود پیدا کرتا ہے اس میں کچھ قباحت نہیں درست نہیں کیونکہ تجارت اور سُود کے درمیان حدِ فاصل متعین کرنا کچھ مشکل نہیں۔ گندم، کپڑا، بُوٹ اور موٹر ایک وقت تک کارآمد رہ کر بیکار یا ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر روپیہ نہیں۔ نہ یہ زنگ آلود ہوتا ہے اور نہ اس کے بغیر کام چلتا ہے۔ تاجر ہر سودے پر ایک منافع لیتا ہے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ جیسے ۱۰ روپیہ کی گھڑی ۱۵ روپیہ پر فروخت کر دی اور ۵ روپیہ

نفع کمایا۔ مگر بنک ۱۰ روپیہ کے قرض پر ایک مرتبہ نفع نہیں لیتا اور متعین رقم نہیں۔ بلکہ ہر وقت اور ہمیشہ جب تک وہ قرض قائم رہتا ہے منافع لیتا رہتا ہے۔ یہ اتنا بڑا فرق ہے جسے سمجھنے میں کوئی اُلجھن نہیں۔

علاوہ ازیں ایک تاجر بیوپاری اور صناع صرف اپنے سرمایہ کی حد تک کاروبار کر سکتا ہے لیکن بنک

(۱) اپنے سرمایہ کے علاوہ قانونی طور پر اس سے کئی گنا زیادہ

(۲) لوگوں کے سرمایہ پر پھر کئی گنا مزید کاروبار کی طاقت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بنک جو ۵۰ سال پہلے ۱۰ کروڑ کے سرمایہ سے شروع ہوا تھا وہ آج ۵۰۰ کروڑ سرمایہ کا مالک بن چکا ہے۔

تاجر کا منافع محنت، سرمایہ، وقت، عقلمندی اور دماغ سوزی سے پیدا ہوتا ہے لیکن سُود کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ "روپیہ کے استعمال کی قیمت ہے"۔ "نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا"۔

سُود بیکاری، کاہلی اور عدمِ محنت کا صلہ اور پیداوار ہے۔ جو سُود پر گذر کرتا ہے۔ وہ گویا قوم پر بوجھ ہے اور قوم میں سے نہیں ہے۔ وہ قوم کے لئے کچھ پیدا نہیں کرتا بلکہ قوم کی کمائی کو ہضم کرتا ہے۔

دنیا کی تمام مصائب کو اگر ایک نقطہ پر جمع کرنا ہو تو لفظ سُود پر اس کا اطلاق درست ثابت ہوگا۔

آرتھر گارڈ فرے کا قول ہے کہ جانتے ہو کہ بچہ دنیا میں آتے وقت کیوں روتا ہے؟ "اسلئے کہ وہ بھوکا ہے، ننگا ہے اور مقروض ہے"۔

سماج کی بہبودی کی کوئی سکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک سُود کی جگہ قرضہ حسنہ نہیں لے لیتا۔ اور سماج کے احیاء کا یہی واحد ذریعہ ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ لوگ اہرامِ مصر کی مثلث تعمیر کو دیکھتے ہیں کتنی مضبوط اور دیرپا ہے۔ اس نے ماہرینِ عالم کو حیرت میں ڈال رکھا ہے لیکن یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ اہرامِ مصر کی پختگی، قیام اور دوام کا مدار اور انحصار صرف اور صرف اس کی بنیاد ہے۔ جو لازماً چوٹی △ سے وسعتِ طول میں زیادہ ہے۔

یہی حال مال و زر کا ہے۔ جتنا روپیہ زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا اور جس قدر جلد گردش کرتا رہے گا بڑھے گا، مفید ہوگا اور قوم کی حالت خوشگوار ہوگی۔

لیکن موجودہ صورت میں قوم کو چند افراد کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیئے۔ اور ان چند افراد کی حالت قابلِ مذمت ہے۔ آج جبکہ روشنی کے زمانہ میں ہم ان لوگوں کو نفرت سے دیکھتے ہیں جو انسانی غلامی کو روا رکھتے ہیں اور رواج دیتے ہیں یقیناً آئندہ نسل ہم سے بھی اسی طرح نفرت کرے گی کہ یہ لوگ پہلے لوگوں کی طرح انسانوں کے نہیں بلکہ روپیہ کے غلام تھے۔ پس روپیہ اور اس کی قیمت یا عزت ایک نسبتی چیز ہے جس کو خود انسان نے متعین کیا ہے لیکن یہی انسان کی مخلوق اس کی معبود بن گئی ہے۔ جب تک انسان اور زر اپنے اپنے مقام پر لوٹ نہیں آتے اُس وقت تک فسادِ عالم کا رُکنا یا مٹنا دُور کی بات ہے۔

پیداوار کے لئے اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کو جمع

کیا ہے۔ اوّل قدرتی ذخائر۔ دوم وقت۔ سوم کام۔ پہلے دو کے لئے تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں وہ تو مفت ہیں۔ پیداوار کے لئے کام کرنا ضروری امر ہے لیکن روپیہ دینا اور سُود لینا تو کوئی کام نہیں کوئی پیداوار نہیں جس سے دولت کی دنیا میں زیادتی ہو۔ بلکہ سُود تو دنیا کی بڑھتی ہوئی دولت کو روکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر بنک تمام نوٹ جو اس نے شائع کئے ہیں قرض دیدے تو اصل زر کی واپسی ہونے پر وہ تمام نوٹ واپس آجائیں لیکن سُود کی ادائیگی کے لئے مزید نوٹ کہاں سے آئیں گے۔ یہ نوٹ جب تک بلا پیداوار کے بطور قرض نہیں لئے جائیں گے اور بلا ضرورت کے شائع نہیں ہوں گے رسّہ کشی نہ ہو سکے گی۔

سُودی منافع کا بھی ایک چسکا ہے ورنہ اس کی اصلیت سراب کی مانند ایک دھوکا ہے۔ جیسے ایک فرانسیسی نے سنہ ۱۹۱۴ء میں ۱۰۰۰ سونے کا سکہ فرانک بنک میں جمع کر کے ۵ فیصدی سُود لینا مقرر کیا اور ۴۰ سال بعد سنہ ۱۹۵۴ء میں اسے دو ہزار بطور سُود مل گیا۔ وہ خوش ہوا لیکن اس بات کو بھول گیا کہ سنہ ۱۹۱۴ء کے سونے کے ۱۰۰۰ فرانک کی قیمت آج سنہ ۱۹۵۴ء میں دو ہزار فرانک نہیں بلکہ ۴۰۰۰۰۰ فرانک کے برابر بنتی ہے۔ اور شرح سُود اس لحاظ سے بز ۲ سے قدرے زیادہ اُٹھے گی اور یہ کس قدر کم اور معمولی منافع ہے جس کا وہ حساب نہیں کر سکا۔

جو روپیہ بنک سے باہر نکلتا ہے وہ بطور قرض باہر جاتا ہے اس لئے روپیہ ہی قرض ہے اور قرض کی بیٹی غربت ہے اور سُود فقط وہ جنس ہے جو بنک سے اوّل باہر نہیں جاتی۔ دوم باہر سے اندر آتی ہے۔ اور سُود بلا قرض نہیں۔ غرضیکہ بیٹی اور داماد دونوں اقتصادیات کی گاڑی کو تباہی میں دھکیل دیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ سُود کا منافع بلا محنت ہاتھ آتا ہے اس لئے مفت کی شراب کی مانند قاضی بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کاروبار کو بلا سُود چلانے کے مسئلہ پر چنداں غور نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ جب لوگوں کی آنکھ کھلی تو سُودی کاروبار چل نکلا تھا اور معمول بذات خود ایک بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کو بدل دینا کہیں زیادہ فکر، وقت اور محنت کو چاہتا ہے۔ اس امر کو خواہ بڑے بڑے ڈاکٹر، پادری، جج، مصنف، شاعر یا مصلح روکیں۔ لیکن یہ ٹھہر نہیں سکتا۔ خاص طور پر اس لئے جبکہ روپیہ پیسہ تمام کا تمام اور سُود کا کاروبار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو تمام ملک کے اَن داتا بن بیٹھے ہوں۔ وہ تمام ملک کی دولت پر حاوی ہیں۔ اخبار ان کے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اُن کے ہیں اور جو کوئی بھی ایسی آواز اٹھائے وہ یکدم بند کر سکتے ہیں اور اس کی زندگی حرام کر سکتے ہیں لیکن آجکل زمانہ سرعت سے بدل رہا ہے ہم ایک بارودی سرنگ پر بیٹھے ہیں اور زیادہ دیر ایسی خطرناک جگہ پر ٹھہرنا مشکل ہے۔ ایک صدی پہلے جن لوگوں نے کوشش کر کے سرمایہ کو بجو دیکر چند ہاتھوں میں شرق و غرب کی دولت کو جمع کر لیا اور صاحب اختیار بن گئے اس وقت وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے تھے اور آج آدھے ایشیا اور یورپ میں سرمایہ دار مرکز دفن ہو چکا ہے۔

ہنری فورڈ سے کون واقف نہیں۔ اس کا بیان ہے کہ وہ نوجوان جو اس سُودی روپیہ کے بحران کو حل کریگا۔

وہ دنیا کی اتنی بڑی خدمت کرے گا جو تاریخ میں تمام سپاہیوں نے مل کر کی ہوگی۔

سُود تو تعزیری پولیس یا قابض فوج ہے جس کا بوجھ عوام کو بلاوجہ اٹھانا پڑتا ہے اور جبراً ڈالا جاتا ہے اور کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔

گو آج یہ مشکل امر نظر آتا ہے مگر ایک بات یقینی ہے کہ یہ سُود خوری، منافع بازی اپنی ہی زہر سے اور اپنی ہی آگ کے شعلے سے تباہ اور راکھ ہونے کی منتظر ہے لیکن سوچنا یہ ہے کہ کس طرح جلد سے جلد دنیا کو اس خطرناک انجام سے بچایا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ سُود کا لینا بنک تو ترک کر دے اور اس کی جگہ حکومت لینا شروع کر دے یا جائز رکھے۔ حکومت جو صاحبِ اختیار ہوتی ہے وہ تو خراب اور خود سر ہو جائے گی۔ کیونکہ دولت خرابی کو دعوت دیتی ہے اور خود سری کا پیش خیمہ ہے جس طرح بنکر کے لئے سُود بوجہ بلا محنت اور پیداوار کرنے کے لینا لعنت کا باعث ہے۔ اسی طرح حکومت کا بلا محنت منافع حاصل کرنا بھی بُرا ہے۔ کیونکہ روپیہ دنیا آور بات ہے اور پیداوار بڑھانا آور بات ہے۔ نیز حکومت کا کام تجارت کرنا یا منافع حاصل کرنا نہیں اور یہ کام عوام کا ہے۔ ہاں حکومت اپنی قوم اور ملک کی جانب سے عائد کردہ ان فرائض سے غافل نہیں ہو سکتی کہ عوام کو ضروریات کی اشیاء فراہم کرے اور ایسی قیمت پر فراہم کرے کہ لوگ انہیں خرید کر سکیں۔

حصّہ دوم

صحیح نظام یا سُود سے بچنے کے طریق!

چونکہ زمانۂ حال کا کوئی تجارتی کاروبار یا تعمیری پروگرام بلا قرضہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا اور قرض بلا سُود مل نہیں سکتا۔ اس لئے یا تو تعمیری پروگرام اور تجارتی کاروبار کو بند کرنا پڑے گا اور یا سُود ادا کرنا ہوگا ہر دو صورتیں مہلک ہیں اور قربانی کا تقاضہ کرتی ہیں۔ عوام اور حکومت کیا پاکستان، ہندوستان یا ایران اور کیا انگلستان، فرانس یا امریکہ سب ہی اسی مسلک پر گامزن ہیں۔ باوجود جنگ کے اور اندرونی خلفشار کے یہ سلسلہ برابر چل رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ نہ تو تعمیر رُک سکتی ہے اور نہ ہی تجارت تھم سکتی ہے لیکن انسانی دماغ کوشش کر کے وہ ذرائع ضرور سوچ سکتا ہے جن کی رہنمائی میں اس مصیبت سے نجات پا سکے۔ سو اوّل مقصد یہ ہے کہ کس طرح بلا سُود کے تجارت اور تعمیر قائم رکھی جا سکتی ہے اور کن کن ذرائع سے حکومت کے پاس اس قدر مال فراہم ہو سکتا ہے کہ وہ قرض و سُود کی آفت سے آزاد اور چند افراد کے دام سے مستغنی ہو جائے۔ اس مطلب کے لئے روپیہ کا بلا سُود مل جانا اور حکومت کا صحیح معنوں میں آزاد اور بادشاہ یعنی مالی لحاظ سے کسی جبر یا شرطِ سُود کا پابند نہ ہونا ضروری ہے۔ کیا یہ درست نہیں کہ

اگر۔۔ ا کروڑ روپیہ قرض جس کی مثال "سُود ۴ فیصدی شرح سے پہلے حصّہ میں دی گئی تھی اور بتایا تھا کہ ۲۵ سال کے بعد اتنی ہی رقم دوبارہ سُود خور وصول کرتا ہے اور اتنی مدّت کے بعد سہ بار اور اصل زر ویسے ہی کھڑا رہتا ہے"۔ بلا سُود ہوتا تو قوم یہ رقم ۴ فیصدی شرح کی بچت سے اس مدّت میں ۲۵ سال میں تمام قرضہ ادا کر دیتی اور حکومت کا خزانہ مضبوط ہوتا ' مالی حالت اچھی ہوتی۔ مرکزی' صوبائی اور شہری کاروبار اپنی اصلی صورت یعنی قبل از جنگ کی سطح پر آجاتا اور تمام جگہ قیمتیں واپس اپنی جگہ لوٹ آتیں۔ مگر سُود کی وجہ سے آج تک ہر جنگ کے بعد قیمت جو بڑھی ہے واپس سابقہ بھاؤ پر نہیں آئی۔ مجوزہ صورت میں ملکی کرنسی بہتر ہوتی۔ پیداوار اور روپیہ کی نسبت مناسب ہوتی قیمت اور تنخواہ یا آمد کا توازن قائم رہتا اور خوشحالی اور فراوانی سے ملک مالا مال ہوجاتا ' برعکس اس کے سود نے ملک کی اقتصادیات کو درہم برہم کر دیا ہے۔ گرانی نے ویرانی پیدا کر کے عوام کے چہروں اور سینوں پر غربت کے تمغے لگوا دیئے ہیں۔ آمد کم ہے خرچ زیادہ ہے۔ آبادی بڑھ رہی ہے' پیداوار کم ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ قرض کا بوجھ کمر توڑ ہے۔ گویا کہ انسان کی زمین پر زندگی آج دوبھر ہوگئی ہے۔ اتنا بار ثقیل اسکے کندھوں پر آپڑا ہے کہ اس کے پاؤں برداشت نہیں کرتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ حکومت کے دروازے سے شروع کر کے غریب کے گھر تک یہ نظام تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے جس کی صورت یوں ہونی چاہیئے

ا۔ حکومت کیا کرے ؟ :۔

پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ حکومت زرِ نقد پر ٹیکس لگائے جو ایسی شرح سے ہو کہ شرح سُود اس کے سامنے بہت کم رہے۔ یعنی اگر یکصد روپیہ سال تک جمع رہے تو ۲٫۵ فیصدی شرح۔ اور جوں جوں جمع رقم بڑھتی جاوے شرح ٹیکس بڑھا دی جاوے یہاں تک کہ ۶ فیصدی سے ۱۰ فیصدی تک اضافہ ہو سکے۔ اس سے سُود خود بخود دب کر رہ جائیگا۔ اور یہ زر ٹیکس تمام اُن رقوم پر عائد ہوگا جو بنک میں محبوس ہیں یعنی انفرادی حساب پر اور کل منافع بنک پر۔ اس طرح ایک بھاری رقم حکومت کو فراہم ہو سکے گی۔ لیکن یاد رہے یہ ٹیکس ان ٹیکسوں کے علاوہ نہیں جو پہلے سے عائد ہیں بلکہ یہ واحد ٹیکس ہوگا اور دیگر ٹیکس یک قلم اٹھا دیئے جاویں۔ چونکہ روپیہ کی منڈی بنک ہے اس لئے جب بنک کی رقوم پر ٹیکس لگے گا تو سُود کی کان یا جڑ پر تبر رکھا جائے گا۔ ایک آمد کا وسیلہ پیدا ہو جائے گا دوسرے بُرائی کا غار بند ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا نام زکوٰۃ ہے جس کو مسلمان بھُول چکا ہے۔

دوسرے مرحلہ پر روپیہ بطور قرضہ حسنہ بوقتِ ضرورت مل سکے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اگر حکومت کو ہوائی یا بحری جہاز بنانے کی غرض سے ا کروڑ روپیہ کی ضرورت ہے تو حکومت بانڈ یا سرٹیفکیٹ اس مالیت کے جاری کرے جن کی پُشت پر حکومت کی ضمانت ہوگی۔ زرِ نقد' سونا یا چاندی کا انبار نہ ہوگا۔ بانڈ اور سرٹیفکیٹ مختلف تعداد کے ہوں گے اور عوام و دیگر ادارے ان کو خرید کریں۔ پھر ان جہازوں کی آمد سے آہستہ آہستہ یہ قرض ادا کیا جائے۔ بانڈ اور سرٹیفکیٹ کی کشش یہ ہوگی کہ اوّل ان رقوم پر زرِ نقد ٹیکس نہ ہوگا۔ اس لئے دوسرا یہ جو ان سرٹیفکیٹ پر

بانڈ پر لگا ہوگا وہ کم نہ ہوگا۔ اور یہ سرٹیفکیٹ بطور خود ایک نوٹ یا چیک کے چلائے جا سکیں گے۔ رہن ہو سکیں گے جس طرح جائیداد رہن ہوتی ہے اور وراثت میں آ سکیں گے۔ کیونکہ یہ کسی صورت بھی سونے چاندی یا نوٹ سے کم نہیں ہوں گے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ لوگ کیوں نہ جلد ان کو روپیہ میں تبدیل کرنا چاہیں گے اور ان نوٹوں کا بوجھ جو ان بانڈ یا سرٹیفکیٹ کے عوض میں دیئے جاویں گے خزانہ سرکار پر پڑے گا۔ اور زیادہ روپیہ گردش میں آ جائے گا جس کی ضمانت سونا نہ ہوگی اور اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں گی اور روپیہ کی اپنی قیمت گر جائے گی۔ اس کا ازالہ اس طرح ہوگا کہ روپیہ میں تبدیل کرنا گویا اپنی رقم کو گھٹانا ہے۔ کیونکہ بانڈ یا سرٹیفکیٹ تو زر ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں لیکن روپیہ نہیں۔ جو بھی ایک سال یا دو سال یا تین سال کے بعد یہ تبدیل کئے جاویں گے تو زر ٹیکس ادا کرنا پڑے گا اور جب گورنمنٹ ادائیگی شروع کرے گی تو پھر کوئی ٹیکس نہ ہوگا کیونکہ یہ ادائیگی اس تعمیری پروگرام کی اپنی پیداوار سے ہوگی کسی قرضہ سے نہ ہوگی۔ اس لئے نہ تو رقم مطلوبہ یعنی جو تعمیری کام پر لگی ہے وہ واپس ہونے والا قرض ہوگا اور نہ ہی اس کا سود اصل زر میں اضافہ کا باعث۔ اصل واپس ضرور ہوگا مگر اسی چیز کی پیداوار سے۔ اس لئے یہ سرٹیفکیٹ اور بانڈ آمد پیدا کرنے والے نہیں کہلاتے۔ گویا یہ تعمیری کام کی تکمیل کا باعث ہیں۔ آمد سے مراد بلا محنت یا بلا حق کے آمد جیسے سود کرتا ہے یا بنک کے وہ حصہ دار جو ایک دفعہ روپیہ بنک کے سپرد کر کے صرف نفع لیتے ہیں اور بنک کا کام کچھ نہیں کرتے۔ ایسے حصہ دار کو مستور یا سوئے ہوئے حصہ دار (Sleeping) کہتے ہیں۔ یہ نکھٹو فقط روپیہ کی کمائی کھاتے ہیں۔

اس صورتِ حال میں گورنمنٹ کو کسی پرائیویٹ بنک کا شرمندۂ احسان نہیں ہونا پڑتا کہ قرض لے اور سود ادا کرے اور نہ ہی پارلیمنٹ کی اجازت کی ضرورت رہتی ہے کہ بجٹ سے زائد مطالبہ کہاں سے پورا کیا جائے گا۔ ان بانڈ اور سرٹیفکیٹ سے حکومت اپنی ضرورت یا تعمیری پروگرام کو بخوبی پورا کر سکتی ہے اور بلا تکلف یہ کثیر رقوم ادا ہو سکتی ہیں اور اسی طرح صوبائی اور شہری حکومتیں اپنے اپنے کاموں کے لئے اپنی ضمانت پر ایسے سرٹیفکیٹ اور بانڈ جاری کر کے فائدہ اٹھا سکتی ہیں اور لوگوں کیلئے بھی بلا سود روپیہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حکومت کے اس طرح نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روپیہ یا نوٹ کے جاری کرنے کا تمام کاروبار بنیادی سٹاک سونا چاندی پر مبنی ہے اور وہ عوام یا بنک کے قبضہ میں ہے۔ اس کے بغیر حکومت نوٹ جاری نہیں کر سکتی اور سونا حکومت کے پاس نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ دھاتی معیار (Gold Standard) جسے سونے کا معیار کہتے ہیں ترک کر دیا جائے اور ہر کام کیلئے کاغذ کا نوٹ استعمال کیا جائے۔ اگر یہ خیال ہو کہ چونکہ کاغذ کی قیمت اور خرید کرنے والی شئے کی قیمت برابر نہیں اسلئے کاغذی سکہ چل نہ سکے گا۔ یہ وسوسہ محض قیاسی ہے۔ ورنہ سکہ کی وزنی یا قیمتی مقدار پر اس کی گردش کا معیار نہیں ہوتا۔ اس کی کامیابی کا معیار گورنمنٹ کی ضمانت اور قوتِ خرید ہے۔ اگر آج سونا پیدا کرنے والے ملک

سونے کو آزادی سے ہر ملک میں داخل کر سکیں تو کل کو سونے کی وہ قیمت اور قوت جو آج ہے قائم نہ رہ سکے گی۔ سکے کی قیمت حکومت اور سماج کی قبولیت پر منحصر ہے اور اس کی ساکھ غیر ملک میں اس کی قوتِ خرید ہے۔ ورنہ لوہا، چاندی، سکہ، سونا، پتھر سب برابر ہیں۔ اس لئے دھاتی کرنسی کی بجائے **کاغذی کرنسی** کو ترویج دی جائے۔ تاکہ حکومت مطابق ضرورتِ ملک و عوام آسانی سے روپیہ مہیا کر سکے۔ مشکلات کے وقت پھر بھی یہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آج تاریخ سے ثابت ہے کہ کوئی جنگ یا تنازعہ کبھی اس وجہ سے بند یا ختم نہیں ہوا کہ روپیہ نہیں ہے بلکہ اس وقت دھڑا دھڑ نوٹ چھپتا ہے۔ ہزاروں کے بعد لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑوں روپیہ بلا ضمانت چاندی سونا چھاپ دیا جاتا ہے۔ اور حکومت کام چلاتی ہے۔ چنانچہ دوسری عالمگیر جنگ کے وقت جرمنی کے سکے کی یہ حالت تھی کہ صبح کے ناشتہ کے لئے ۲۰۰۰۰ مارک جو جرمن روپیہ تھا دو شلنگ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تبادلہ کی نسبت اسی لئے پیدا ہوئی کہ ضروریات کو پورا کرنا اہم کارِ جنگ تھا۔ سونا چاندی موجود نہ تھا۔ اس لئے نوٹ بلا ضمانت چلتے رہے اور جب عوام کو پتہ چلا کہ اس کی قوت خرید۔ جس کا ذریعہ غیر ملکی منڈی ہے جاتی رہی ہے۔ تو اس کی شرح تبادلہ کا توازن قائم نہ رہ سکا۔

یہی وجہ ہے کہ حکومت کو بھی سود ادا کرنا پڑتا ہے حالانکہ نوٹ اور سکہ کا اجراء حکومت کرتی ہے۔ لیکن بلا ضمانت سونا چاندی نہیں کر سکتی۔ اس لئے یہ حکومت عوام کی کماحقہ خدمت نہیں کر سکتی۔

حکومت کا بنک کو سود دینا اس لئے کہ وہ قرض لیکر مکانات۔ جنگلات۔ نہریں۔ ریلیں۔ جہاز۔ فیکٹریاں۔ کارخانے اور ترقیاتی ادارے قائم کرے۔ گویا کہ حکومت اس ٹیکس کو لوگوں پر ڈال کر ان کو ٹیکسوں کے عمیق گڑھے میں غرق کرنیوالی ہوگی۔ کیا ایسی حکومت سے کسی بہبودی کی توقع ہو سکتی ہے؟ اور وہ حکومت جو عوام کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی یا اتنی مہنگائی کو روک نہیں سکتی جس سے ان کی ضروریات پوری ہوں ان کی چیخ و پکار کو نہیں سنتی یا ان کے حالِ زار کو نہیں دیکھتی اور بے خبر ہے۔ اس کو کیا حق ہے کہ صاحبِ اقتدار رہے۔ حکومت کی آزادی اور مضبوطی اسی امر میں ہے کہ گورنمنٹ بوقتِ ضرورت روپیہ مہیا کرنے پر قادر ہو کسی کی محتاج نہ ہو۔ اس کے لئے اوّل شرط زرِ نقد پر ٹیکس لازمی ہے۔ تب قرضہ حسنہ کا راستہ کھل سکتا ہے۔ تب حکومت اپنے سرکاری بجٹ اور بنکوں کی کاسۂ گدائی سے بچ سکتی ہے۔ اور لوگوں کے لئے کوئلہ۔ لوہا۔ سیمنٹ۔ پٹرول۔ دھاتی کارخانے و ریلوے وغیرہ مہیا کر سکتی ہے۔ اور لوگوں کو قرض دے سکتی ہے جن کو عوام اسی قرض سے پیدا کردہ دولت سے رقوم قرضہ واپس لوٹا سکتے ہیں۔ خوشحالی کی یہ کیفیت دونوں ملک اور قوم کے لئے قابلِ فخر ہوگی۔

بنک کیا کرے؟

بنک کی آمد کے ذرائع پر غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ وہ سود کے علاوہ اور نالیوں کے ذریعہ بھی روپیہ فراہم کرتا ہے۔ قابلِ اعتراض فقط یہی صورت منافع اور آمد ہے کیونکہ یہ مفت اور بلا استحقاق آتی ہے۔ ورنہ بنک کی محنت اور کام کو بلا عوض حاصل کرنا فریق ثانی یا زیر بحث نہیں ہے۔ جس طرح مزدور اپنی مزدوری اور ڈاکٹر اپنی فیس۔ اور بیوپاری اپنے منافع کا حقدار ہے اسی طرح بنک بھی اپنی محنت کے صلہ اور معاوضہ کا حقدار ہے

جس کی کسی صورت میں بھی تحقیر نہیں کی جا سکتی۔ بنک کی آمد کا ایک سورا خ سُود کا اگر بند کر دیا جائے تو اس کی آمد میں اسقدر فرق نہیں آتا کہ وہ منافع بخش کاروبار نہ کر سکے کیونکہ اس کی آمد ان حصص کے منافع سے ہے جو اس نے فیکٹریوں کارخانوں، ملوں اور دیگر دولت پیدا کرنے والے اداروں سے خرید رکھے ہیں۔ اور یہ منافع جب تک یہ کاروبار چالو رہتا ہے آتا رہتا ہے۔ اسی طرح پرائیویٹ اداروں کے کفالت نامے اور بانڈ منافع لاتے ہیں۔ بنک کے پاس جو جائیداد بیں قرضہ لینے والوں کی ہوتی ہیں ان سے نفع کثیر حاصل کرتا ہے۔ اور دیگر اُدھار لینے والی اسامیوں سے باقی کاروبار مثلاً ٹھیکے، سفارش حصص یا مراعات علاوہ سُود کے حاصل کرتا ہے۔

مزید برآں پرائیویٹ چیک یا بل جو اکٹھے کرتا ہے یا ادا کرتا ہے ان کی فیس اور معاوضہ لیتا ہے۔ یہ خدمات بنک کے لئے بہت بڑا منافع پیدا کرتی ہیں۔ اگر بنک کا سُود کا پہلو اصلاحات کی نذر ہو کر خشک بھی ہو جائے تب بھی اس کا دھندہ سرسبز رہتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک معمولی قربانی سے انسانیت کی خدمت نہ کی جائے آخر جب سُود بند ہوگا تو زرِ نقد پر ٹیکس لاگو ہوگا تو بنک بھی سُود کسی کو نہ دے گا سونے والے حصہ دار کو مفت میں منافع نہیں ملے گا اور عمارات کے کرایہ میں بھی فرق پڑے گا۔ اور یہ تمام بچت سُود کے منافع کو پورا نہیں تو بہت حد اس کی دلجوئی کا موجب ہوگی۔

بنک کے ذریعہ سے زرِ نقد ٹیکس کی وصولی آسان ہوگی ... خدمات ... حکومت سے لیا جا سکتا ہے نیز غیر ملکی سکوں کے تبادلہ کا کاروبار بنک کی معرفت ہوتا ہے جس پر کمیشن ملتا ہے۔ اور یہ آمد بھی کوئی معمولی نہیں۔ غرضیکہ ایک سُود کو ترک کرنے سے کوئی غیر معمولی کمی واقع نہیں ہوتی اور آمد میں خسارہ نہیں آتا۔ صرف تجربہ کی ضرورت ہے۔ بنک سُود کے بغیر اس طرح کاروبار بھی کر سکتا ہے کہ قرضہ پر سُود بجائے قرض کی واپسی کی ضمانت کے طور پر جائیداد رہن رکھے، قبضہ لیکر کرایہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اس جائیداد کی **دیکھ بھال** اور **حفاظت** کے اخراجات اور **معمولی منافع** مقرر کر دے اور اسے باقساط ایک لمبے عرصہ میں وصول کرے۔ مثلاً ایک مکان دس ہزار روپیہ کا اُدھار کے عوض مکفول ہو تو وہ گیارہ ہزار روپیہ بیس سال میں بذریعہ اقساط وصول کر سکے گا۔ اس ایک ہزار روپیہ میں اس کا منافع، حفاظت، مرمت وغیرہ سب کچھ آ سکتا ہے اور یہ نہ سود ہے اور نہ غیر محفوظ۔ چنانچہ سپین کے بنک اسپانیہ کی مثال دی جا سکتی ہے کہ وہ تمام کاروبار اسی رہن جائیداد کی بنا پر کرتا ہے اور ۲۵ سال کے عرصہ میں قرض کی رقم معہ اضافہ قلیل وصول کر لیتا ہے اور اس کی سالانہ آمد وغیرہ کے گوشوارہ کی **تفصیلات** سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا کاروبار بڑا کامیاب ہے۔ تو یہ کہنا کہ بنک کا کاروبار بلا سود کے چل نہیں سکتا درست نہیں۔ اسلامی سلطنت کے عروج کے وقت بھی سُود کا لینا حرام تھا اور بڑی بڑی تجارتیں اور کاروبار بلا سُود کے تھے۔ بنک کا اس وقت نام و نشان نہ تھا۔ انفرادی طور پر ضرورتمند قرضہ حسنہ لے کر کام چلاتے تھے اور بعد ضرورت واپس کر دیتے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ

مقروض کے مکان کے سایہ میں بھی کھڑا ہونا پسند نہ کرتے تھے، شاید کہ وہ سُود ہو۔

عوام، بنک اور حکومت کے تعاون کی صورتیں

بنک اور حکومت کے فرائض کے ابتدائی اور سرسری مطالعہ کے بعد اب مشترکہ طور پر یکجا اِس امر کا بیان ہونا ضروری ہے کہ عوام، بنک اور حکومت آپس میں کس طرح تعاون کریں کہ سرمایہ ڈر کر بھاگ نہ جائے نہ غائب ہو، عوام سُود کی لعنت اور دیگر بلا محنت کے منافع اور ناجائز بوجھ کی وجہ سے جو قیمتوں میں غیر موزوں اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے عوام کی قوتِ خرید اور بچت کی سطح گر جاتی ہے اس سے بچ سکیں اور حکومت ایسی حکمت عملی سے قانون بنائے اور نگرانی کرے کہ مالی نظام کی مثلث کا توازن قائم رہے۔ اس کی شکل یہ ہوگی:-

۱۔ حکومت سُود، منافع ناجائز، بلا محنت کا منافع کرایہ کو ممنوع قرار دے کر اصل رقم، راس المال کی واپسی کی اجازت دے۔

۲۔ کرایہ دار مکان اور دکان کو حق ہو کہ وہ مکان اور دکان کی ایک مدت رہائش کے بعد کُل قیمت معہ مناسب منافع ادا کرنے کے بعد بذریعہ حکومت ملکیت کے حقوق حاصل کر لے ......

تاکہ زائد از ضرورت ذاتی مکان اور دکان حاجتمند کے پاس بھی ہو جائے اور یہ بلا محنت کا منافع جسے کرایہ کہتے ہیں دراصل اصل زر کا سُود ہی ہے یعنی قطعہ سفید کی قیمت، عمارت کی لاگت کی میزان کل پر رہا ہوا کرایہ کی شرح جو ہمیشہ ہمیش کرایہ دار دیتا رہے گا اور باوجودیکہ وہ کُل قیمت اور منافع کی مناسب رقم بھی ادا کر دے گا لیکن کرایہ دار کا کرایہ دار ہی رہے گا اور مکان دکان باوجود اپنی کل قیمت اور منافع دینے کے پھر بھی مالک کی ہی ملکیت رہیگا۔ جو کسی طرح سُود سے کم نہیں۔ اگر ملکیت منتقل ہو جائے گی تو حکومت کا فرض ہوگا کہ رہائشی مکان اور کاروبار گذران کے موافق دکان ہر قسم کے ٹیکس سے آزاد رہے۔ تاکہ ہر شہری کسی جائیداد کا کا مالک بن سکے اور اس ذمہ داری کے ذریعہ آزادی ملک کی قدر کر سکے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ کرایہ دار تمام عمر مالک مکان کا غلام رہتا ہے اور مالک مکان تمام عمر حکومت کا غلام رہتا ہے اور وہ اس سے جائیداد ٹیکس وصول کرتی ہے حتیٰ کہ مالک مکان بھی ٹیکس کی شکل میں مکان کی کل قیمت ایک وقت حکومت کو ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح حکومت دو دھ بھی لے جاتی ہے اور گائے بھی۔ کرایہ دار، مالک مکان، دونوں خسارہ میں رہتے ہیں اور حکومت لوگوں کی بدحالی کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے۔

۳۔ حکومت کو شہری قطعات سکنی یا تجارتی کی خرید کی حد بندی اور زرعی اراضی کی خرید کی حد بندی کرنا ہوگی۔ تو کہیں لوگ آئندہ قیمت بڑھا کر فروخت کرنے کے خیال سے باز رہیں گے اور انکی قیمت گراں نہ ہونے پائے گی۔ ورنہ جوں جوں شہری

آبادی بڑھے گی قطعات اراضی کی قیمت میں اضافہ ہوگا اور وہ بیوپاری جس نے محض منافع کیلئے ایسے قطعات یا اراضی خرید کی ہوگی وہ ناجائز نفع پیدا کرکے لاگت مکان یا دکان میں اضافہ کی وجہ سے کرایہ اور قیمت کو بلاوجہ بڑھا دیگا اور یہ قومی نقصان ہے۔

۴- حکومت ضروریاتِ زندگی جیسے نمک، ایندھن، پانی، سیراب کرنے کا نہری پانی وغیرہ اور عوام کی لازمی حاجات مثل ریلوے، ٹرام، بجلی، گیس، تار، ٹیلیفون وغیرہ کا نرخ، کرایہ، فیس یا ٹیکس کم کرے۔

۵- تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے حکومت سودی قرضہ لیکر اسے شروع نہ کرے بلکہ وہ قرض لے جو بلا سود ہو اور اصل کی واپسی ہو جیسے بانڈ اور سرٹیفکیٹ جاری کرکے روپیہ فراہم کرے جو زرِ نقد ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے اور ایک معین وقت کے بعد کارخانہ، ریل، فیکٹری یا جہاز کی آمد کے بعد ادائیگی کی جائے۔

لوگوں سے ایک حد سے زائد منافع کی آمد پر ٹیکس وصول کیا جائے۔ جیسے گزشتہ جنگ کے ایام میں سالانہ -/۲۶۰۰ روپیہ منافع سے اوپر منافع حکومت لے لیتی تھی اور بعد میں اس کا کچھ حصہ بذریعہ اقساط ادا کرتی تھی۔

بڑی جائیداد والے لوگوں کی تو تیدگی پر انکے ورثاء سے جن کے قبضہ میں مفت میں اتنی جائیداد آ جائے گی اس سے ایک فیس معقول وصول کرے اس کے علاوہ طوعی چندہ جات، ہدایا اور دیگر وصولی کی رقوم جو بعض افراد، ادارے، غیر ملکی لوگ اور اوقاف دیتے ہیں ان سے جو سرمایہ اکٹھا ہو پروگرام کی تکمیل پر صرف کیا جائے۔

۶- حکومت ہر بنک کے حصے خرید کرے لیکن حکومت کی نمائندگی ۲۵ فیصدی سے زیادہ نہ ہو اور انتظام پرائیویٹ افراد کے ہاتھ میں رہے۔ حکومت کی حصہ داری محض نگرانی اور عوام کی نمائندگی ہوگی۔ نیز بنک کے حصہ داروں کی تعداد بڑھانے کیلئے عوام کے لئے حصہ داری کھول دے۔

۷- حکومت بنک کے سود والے حصہ داروں کا سرمایہ اور منافع **قومی ملکیت** قرار دیکر ۲½ فیصدی سالانہ منافع میں سے اور ۲½ فیصدی سالانہ سرمایہ اصل میں سے کل ۵ فیصدی سالانہ زرِ نقد ٹیکس کی صورت میں وصول کرکے ایک مدت میں ختم کر دے۔

۸- زرِ نقد ٹیکس کو لازمی قرار دے اور بنکوں کے ذریعہ وصول کرے۔ تمام وہ نوٹ اور سکہ جو مرکزی بنک کی مقررہ تعداد سے زیادہ ہے وہ زرِ نقد ٹیکس کے تحت ہو۔ خواہ وہ میدان میں گردش کر رہا ہو یا بنک کے خزانہ میں پڑا ہو۔ اسی طرح ہر حصہ دار اور حساب رکھنے والے کی رقم پر ایک سال کی مدت گزرنے پر زرِ نقد ٹیکس وصول ہو۔ اس طرح بہت بھاری رقم حکومت کے ہاتھ آجاتی ہے اور عوام سے بھی اسی طرح زرِ نقد ٹیکس وصول ہوگا۔ یہ ٹیکس سرمایہ کو بند ہونے سے بچائے گا بلکہ ایندھن کا کام دے گا جو روپیہ کی گردش کی مشین کو حرکت میں رکھے گا۔ یہ ٹیکس لوگوں کو مجبور کرے گا کہ سرمایہ

کو کاروبار میں لگائیں تاکہ ملک کی پیداوار بڑھے وہ منافع اٹھائیں اور حکومت زرِنقد ٹیکس لے اور خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ یہ ٹیکس ایک معمولی نظام کے ذریعہ بہت بڑے حساب کتاب کے محکمے اور وصولی ٹیکس کے عملے سے بھی اس طرح نجات دے سکتا ہے کہ سالانہ نوٹ شائع ہوں۔ صرف نوٹ شائع کرنے کے معمولی اخراجات کے عوض جعلی نوٹ کا کاروبار یک لخت بند ہوگا اور زرِنقد ٹیکس کی وصولی اگر ۱۰ فیصدی شرح سے ہو۔ یہ شرح ابتداء میں زیادہ ہونا ضروری ہے تاکہ شرح سُود سے زیادہ رہے اور سُود کی ترغیب کو روک سکے۔ تو کُل اجرا رشدہ نوٹ کی تعداد سے اگلے سال کے تبادلہ کے نوٹ ۱۰ فیصدی کم شائع ہوں گے۔ اس طرح مرکز میں بھی کمی کے ذریعہ وصولی کا اندازہ لگ جائے گا اور عوام بھی روپیہ کو دبا نہیں سکیں گے۔ سال کے اندر اندر صرف کرنا ہوگا ورنہ تبادلہ کرانا ہوگا اور تبادلہ کی شرح زرِنقد ٹیکس کی شرح ہوگی۔ ۱۰۰ روپے والے کو ۹۰ روپے ملیں گے۔ اسی طرح سال بسال کام چلتا رہے گا۔

۹۔ حکومت کاغذی نوٹ جاری کرے گو خوردہ سکے برابر چالو رہیں گے مگر اس نوٹ کی پشت پناہ لازمی نہیں کہ سونا ہو یا چاندی۔ کیونکہ سکہ عوام اور ملک کی ساکھ اور حکومت کی شہرت پر چلتا ہے خواہ وہ چمڑے کا ہو یا لوہے کا، سونے کا ہو یا چاندی کا، کاغذ کا ہو یا کپڑے کا۔ سکّہ کی قیمت سماج کی اپنی پسند اور قبول پر تجویز ہوتی ہے کسی دھات کے اچھا یا بُرا ہونے پر نہیں۔ روپیہ یا نوٹ کے عوض حکومت سونا دینے کی پابند نہ ہو۔ اور بیرونی تجارت کے لئے برآمد اور درآمد کا توازن۔ ورنہ اپنے سونے کے سٹاک سے سونا۔ اس لئے سونے کا سٹاک حکومت کے خزانہ میں اکٹھا کرنے کے لئے تمام بنکوں اور عوام سے سونا لے لیا جائے۔ بیرون ملک جانا بند کر دیا جائے اور محض ایسے لوگوں کو ضرورت کے مطابق جیسے کسی فن۔ پیشہ ور یا ادویات۔ یا تحقیقات وغیرہ کے لئے ضروری ہو تو دیا جائے۔ یہ کوئی عجب مسئلہ نہیں۔ ۱۹۳۳ء میں امریکہ میں ڈالر کی حالت خراب ہوگئی تو امریکہ کے صدر روزویلٹ نے قانوناً تمام سونا تمام بنکوں سے لے لیا اور عوام کا اپنے پاس جمع رکھنا بھی ممنوع قرار دے دیا۔ برآمد بند کر دی۔ اس طرح یہ سونا تمام حکومتوں کا محفوظ سرمایہ ہوگیا جسے فیڈرل ریزرو کہتے ہیں۔ اس کی بناء پر ڈالر کا سکہ کاغذی جاری کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ سوائے امریکن شہری کے اور کوئی ڈالر کے تبادلہ میں سونا نہیں لے سکتا۔ اور اس کاغذی سکّہ سے بخوبی کام چلتا رہا اور چل رہا ہے۔ اس کامیابی کی بناء پر امریکہ نے سونا رکھنے کی تعزیرات تمام امریکن شہریوں پر عائد کر دی جو امریکہ سے باہر رہتے ہیں۔ یہ ترمیم ۱۹۶۱ء میں

گئی تھی۔ اس سکیم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ امریکہ کے لوگ تعلیم اور قومیت کے زیر اثر روشن دماغ ہو گئے ہیں اور ان کے ماہرین اقتصادیات پروفیسر کین اور ٹربفن صاحبان کا کہنا ہے کہ "سونا بطور دولت یا سکہ پرانے زمانہ کی وحشیانہ نشانی ہے اور سونے کو مال و دولت کی حیثیت سے دیکھنا فضول بات ہے۔" یہاں کے لوگ تو فی الحال اس مقام تک نہیں پہنچے کہ اس نکتہ کو سمجھ سکیں۔

تاہم جنگ ثانی کی تباہ کاری کے نتائج میں سے ایک "بین الاقوامی مالی سرمایہ" کا وجود اور اس کا قیام ہے۔ جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ امیر ملک اس سرمایہ میں ایک نسبت اپنے سرمایہ کی جمع کرائیں اور اس فنڈ سے غیر ترقی یافتہ ممالک قرض لے کر اپنی مالی مشکلات کو حل کر لیں اور جنگ کی نوبت سے دور رہیں۔ اب تجویز یہ ہے کہ یہ ادارہ تمام بین الاقوامی متحدہ تنظیم کے ممبروں سے ان کے ملکی سرمایہ کا کچھ حصہ سونے کی شکل میں بطور ضمانت جمع کر رکھے اور خود ایک سکہ کاغذی جاری کرے اور ان ممالک میں تقسیم کرے تاکہ آئندہ بین الاقوامی ادائیگی اس کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے ہو اور سونے کے لینے اور دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اس طرح سونے کی حیثیت بطور مال یا دولت کے گر جائیگی، اسے گرنے دو۔ اس کا دولت کی حیثیت سے معزول ہو جانا گویا کہ قتلِ دجال ہے۔ سونا خود دجال ہے اور اگر وہ دجال کا حربۂ عظیم ہے۔ اسی گروہ کے ہاتھوں قتل ہوا چاہتا ہے کیونکہ مسیح کی آمدِ ثانی قتلِ دجال کا تقاضہ کرتی ہے۔

۱۰۔ حکومت سوائے زر نقد ٹیکس باقی مالی ٹیکس ترک کر دے گی۔ نہ ذاتی رہائشی مکان پر ٹیکس ہوگا نہ ذاتی دکان پر۔ اس سے حکومت کی آمد اور بڑھیگی نہیں تو کم بھی نہ ہوگی۔ نیز سُود کے ممنوع ہونے سے وہ بوڑھے، بچے، یتیم یا بیوگان جن کی گزران فقط سُود کی آمد پر تھی یا کرایہ پر یا بلا محنت اور ناجائز منافع پر، حکومت ان سب کو امداد دے گی تاکہ وہ بحیثیت شہری نان و نفقہ حاصل کر سکیں اور بھیک نہ مانگیں۔

بنک کی آمد سُود کی مد کو پورا کرنے کے لئے عدم ادائیگی سُود منجانب بنک کی بچت، کرایہ کی بچت، نیز ملکی زیادہ پیداوار کی وجہ سے بنک کے منافع حصص میں اضافہ اور حصص کی قیمت فروخت میں اضافہ یہ سب رقوم مل کر کسی صورت میں بھی بنک کو خسارہ میں نہیں رہنے دیں گی اور بنک خدمتِ خلق اور ذاتی مفاد کا حصول دونوں بیک وقت کر سکے گا۔ اور صحیح معنوں میں ملک کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہوگا۔

عوام کو اب جبکہ بلا سُود قرض مل سکیگا وہ مفید فقط اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی پیداوار کے بڑھانے میں لگایا جائے گا ورنہ وہ زر نقد ٹیکس کے تحت اگر روز بروز کم ہوتا جائے گا اور بوجھ بڑھے گا۔ اگر عوام ذاتی سرمایہ کو

ملکی پیداوار کے بڑھانے کے علاوہ سونے کی شکل میں یا زیورات میں بند رکھیں گے تو وہ کمائی نہ کرے گا اور حکومت کے قانون کے تحت کسی روز چھن جائے گا۔ اور بطور زرِ نقد ٹیکس کے گھٹن شروع ہو جائے گا۔ البتہ بنک میں جمع ہونے کی صورت میں چالو حساب میں یا دیگر کاروبار میں لگنے کے باعث محفوظ رہ سکے گا۔ اس طرح بچت کی صورت بھی رہے گی اور قومی بنک بھی اپنا کاروبار چلاتے رہیں گے ورنہ پرائیویٹ کاروبار کے منافع کثیر کی صورت میں عوام حکومت کی بانڈ اور سرٹیفکیٹ کے ذریعہ امداد کر سکینگے اور اپنے سرمایہ کو محفوظ کر لیں گے۔ جائیداد مکانی یا دکانی پیدا کرنے کی صورت میں بھی نذرِ نقد ٹیکس نہ ہوگا مگر یہ جائیداد عوام کے فائدہ کے لئے ہوگی۔ سرمایہ مالک محفوظ ہوگا۔ اور آہستہ آہستہ کرایہ دار سے موزوں منافع کے ساتھ لوٹ آئے گا۔ بہرصورت سُود کے نہ ہونے سے اور نذرِ نقد ٹیکس کے ہونے سے مالی نظام میں کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں۔ اگر ایسی کوئی صورت پیدا ہوئی تو وہ عارضی ہوگی۔ روپیہ گردش میں رہے گا۔ پیداوار بڑھیگی۔ زیادہ سے زیادہ مفید ہوگی۔ قوتِ خرید اور بچت میں اضافہ ہوگا۔ جس کو دوسرے لفظوں میں خوشحالی کہتے ہیں اور یہی مالی نظام کی خوبی ہے۔

سُود کی تعریف اور اس کی اقسام

ربٰوا کا اطلاق ہر ایک اُس شرح پر ہوتا ہے جو روپیہ کے استعمال کی قیمت کے لئے مقرر کی جائے خواہ وہ ایک فیصدی ہو اور خواہ ۲۰ فیصدی۔ یہ سب ربٰوا میں شامل ہے۔ یہ الگ امر ہے کہ کسی ملک میں سُود کی شرح ۸ فیصدی سالانہ ظالمانہ تصور کی جاتی ہے اور کسی جگہ ½۱۲ فیصدی۔ جائیداد کی بنا پر قرضہ کی شرح سُود نسبتاً کم رکھی جاتی ہے اور اسے شریفانہ یا معتدل سمجھا جاتا ہے۔ اِس سود کی شکل کو اگر نام کے لحاظ سے منافع، حصہ داری، بچت یا کچھ بھی کہہ لو مگر **روپیہ کے استعمال کی قیمت کے طور پر جو رقم بلامحنت اضافہ کرے وہ سُود ہوگی۔** چونکہ اہلِ ہنود اور یہود دونوں قومیں سُود کی بدولت پلتی ہیں انہوں نے اس منافع کی بہت سی اقسام پیدا کر لی ہیں جن کا ذکر اس جگہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سُود خور قومیں چونکہ خود روپیہ کی غلام ہوتی ہیں اس لئے ان کو غیروں کی غلامی میں جانا کچھ عار معلوم نہیں ہوتا۔ تاریخِ ہند اس بات کی شاہد ہے کہ غیرملکی غلامی کو اہلِ ہنود نے جس آسانی سے قبول کیا اس کا ذکر لارڈ میکالے نے یوں کیا ہے کہ ہندوستان کی ہندو قوم غیرملکی حکمران کے لئے بہترین رعایا ہے۔ گویا یہ غیرملکی غلامی کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ یہی حال یہود کا ہے وہ ہر جگہ غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو **سُود مفرد** یعنی اصل زر × شرح × مدت سے منافع حاصل کرتا تھا پھر جب اس کا لالچ اور اس کی حرص بڑھ جاتی تو (اصل زر + سُود) × شرح × مدت یعنی **مرکّب سُود** حاصل کرنے کے درپے رہتا تھا۔ اس طرح غریب زمیندار، صناع، پیشہ ور، مزدور ہمیشہ ہی مقروض رہتا تھا اور باوجود مسلسل ادائیگی کے خلاصی نہ پا سکتا تھا۔ مقروض کی جہالت مزید برآں اضافہ کی موجب تھی اور یہ زر کی غلام قوم مسلمان پر حکومت کرتی تھی۔ یہود سُود کی ادائیگی میں مقروض کے بچے، بیوی، جائیداد سب کچھ لے لیتے تھے

بسا اوقات مقروض یا اس کی اولاد قارض کی غلامی کرتی تھی۔ خدمتِ ذاتی کے علاوہ تمام کمائی بھی مالک کو ملتی تھی۔

بائیبل اور قرآن کریم میں یہود کو سبت کے ماننے کا حکم تھا یعنی سبت کے دن جو ہفتہ کا دن تھا لازم تھا کہ ان کا مرد و عورت، غلام، نوکر، مویشی، قیدی یا مہمان، بچہ یا بوڑھا کام نہ کرے یعنی محنت نہ کرے اور کمائی کی صورت پیدا نہ کرے۔ اُس دن بالکل ہر چیز کو آرام دیا جائے۔ یہاں تک کہ شکار کی بھی ممانعت تھی تاکہ چرند و پرند اور دریا کی مچھلیاں بھی ایک دن کی آزادی منا سکیں۔ مگر کلام پاک میں مذکور ہے کہ یہود بہتے دریا کے کنارے سبت شروع ہونے سے پہلے کاٹ دیتے تھے تاکہ پانی نکل کر ادھر اُدھر پھیل جائے اور وہاں وہ گڑھے کھود دیتے تھے تاکہ مچھلی جو بہتے پانی کے ساتھ آئے وہ گڑھے میں بند ہو کر رہ جائے اور سبت کے اختتام پر وہ نکال سکیں۔ اس طرح وہ سبت کے دن بہت بڑا منافع حاصل کرتے مچھلیاں اُس روز آزادی اور امن کی وجہ سے بکثرت آتیں اور یہود نے ان کے پکڑنے کا یہ حیلہ کیا جس پر اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ چلن ان کا آج تک قائم ہے۔ وہ روپیہ کو تمام عمر، تمام جگہ، تمام دن گردش میں یعنی بہنے دیتے ہیں اور اس کے منافع سُود کو اکٹھا کرتے ہیں اور ایک دن کی بھی کمی یا معافی نہیں رکھتے۔ چونکہ مسلمان کو اس قدر زر کے ساتھ دلکشی نہ تھی اس لئے اس کے لئے قرآن پاک نے یہ تعلیم دی کہ جمعہ جو تمہاری عید کا دن ہے جس طرح یہود کا ہفتہ یا سبت تھا اُس دن جب تمہیں نماز کے لئے پکارا جائے تو چلے آؤ اور جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو بے شک کاروبار کرو۔ گویا تمام دن میں ایک دو گھڑی کے وقفہ کی تاکید کی ہے۔ یہ فرق ہے اِن دو قوموں کا جو سُود خوار ہیں اور جو سُود سے متنفر۔ اور اب جو مسلمان سُود لینے لگا ہے وہ محض تقلیدِ مغرب ہے اور تاکیدِ نفی سے غفلت۔ ورنہ کم ہی ایسا مسلمان ملے گا جو سؤر کا گوشت کھاتا ہو۔ کیونکہ بار بار اس کے کانوں میں ڈالا گیا کہ یہ طعام قابلِ نفرت ہے۔ اگر اسی طرح سُود و دیگر بُرائیوں کی طرف توجہ ہوتی تو مسلمانوں کی اِس جانب بھی توجہ نہ ہوتی۔

حرمتِ سُود کی حکمت

سُود کی ممانعت کی حکمت یہی ہے کہ سُود مالی نظام میں ہیجان برپا کرتا ہے۔ رزق میں کمی کرتا ہے اور فاقہ مستی کو دعوت دیتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی روک تھام کیلئے بار بار مالک کو مجبوراً ایسے قوانین وضع کرنے پڑے جس سے سُود کے اثرات کو کم کیا جائے۔ شرح سُود کم کی گئی۔ حساب کتاب کی باقاعدگی لازمی قرار دی گئی اور ساہوکاری کیلئے لائسنس لینے کی شرط لگائی گئی۔ قرضہ چکانے کے لئے مصالحتی بورڈ بنائے گئے۔ رہن ہونے اراضی کو آزاد کرانے کی آسانی پیدا کی گئی اور قرضہ کی ادائیگی کے لئے ضروریاتِ زندگی کے سامان کو قرقی اور نیلامی سے محفوظ کیا گیا۔

ہندوستان میں انگریز کے قدم اُس وقت جم گئے جب مسلمان حکمرانوں نے حقوق دیوانی فروخت کئے۔ یعنی انگریزوں کو جو تجار تھے اور قرضہ پر سُود لیتے تھے، اس کی وصولی کا حق ان کو دے دیا۔ اور انہوں نے اپنی عدالتیں اور اپنا بیوپاری قانون جاری کیا لیکن آہستہ آہستہ ملک بیدار ہؤا اور اُن مظالم اور قرض و سُود کی داستان نے عوام

کو سبے چین کر دیا اور ان کی فطرت پکار اُٹھی کہ اس کے انسداد کی ضرورت ہے۔ اس لئے جب قانون بنا تو لوگوں نے اس کو اپنایا اور آزادی کا سانس لیا۔ اس پہ ملک میں مظالم کے خلاف لوگوں کی آہ و فغاں جب انتہا تک پہنچ گئی تو قانون وضع ہوا جس نے اُن کی حق رسی کی۔ اصل قانون باہر سے نہیں آتا۔ جو قانون باہر سے آتا ہے وہ ناکام رہتا ہے لیکن جو اندر کے حالات کے مطابق بنتا ہے وہ دیرپا اور لوگوں کا تعاون حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا قانون فطرتِ انسانی کا قانون ہے جو بدلتی نہیں۔ اسلئے انسانیت کی آواز ہے۔ جو اس ہستی کے منہ سے اور ایسے مقام سے بلند ہوئی جو ملک و قوم، امیر و غریب، آج اور کل، نشیب و فراز، دن اور رات، تغیّر و تبدّل کے کلیہ سے بالا و اعلیٰ تھی۔ یہ قانون غیر مبدّل اور اٹل ہے۔ جلد یا بدیر انسان تجربہ و مصیبت اٹھا کر اسی قانون کی اطاعت کے لئے مجبور ہوگا اور یہ اسی کی بہتری کے لئے بنایا گیا ہے کیونکہ جس طرح جسم کی پرورش کے لئے خوراک لازمی ہے اسی طرح دنیا میں امن اور خوشحالی کے لئے موزوں مالی نظام کی ضرورت ہے جس سے مساوات یعنی انسانیت قائم رہے اور غلامی یا بُت پرستی بھاگ جائے۔

حکومت کے لئے طریق عمل

پس حکومت کا سُود کو ترک کرنا اور زرِ نقد ٹیکس کا نافذ کرنا قابلِ تحسین فعل ہوگا۔

اندرونِ ملک میں اُوپر بیان کردہ سرگزشت کے مطابق کاروبار چلایا جا سکتا ہے۔ اور بیرونِ ملک کے لئے "بین الاقوامی سکّہ" کے نفاذ سے یہ روک بھی دُور ہو سکتی ہے۔ اگر بین الاقوامی معیار میں سونا کو موجودہ اہمیت سے گرا دیا جائے اور اس کی جگہ بین الاقوامی ساکھ جس کے پیچھے بے شک سونے کا انبار ہو کاغذی نوٹ لے لے تو بہت حد تک ناجائز منافع کا تصور بھی مٹ سکتا ہے۔

بہ صورت ملاحظہ کریں کہ جن ملکوں میں سونا معیارِ سکّہ ہے جیسے انگلستان میں سٹرلنگ جسے عوام پونڈ کہتے ہیں۔ یا ڈالر جو امریکہ کا سکّہ ہے۔ گو ان کے بھی نوٹ ہوتے ہیں مگر ان کے پیچھے سونا دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس سکّہ (پونڈ یا ڈالر) کی نسبت تبادلہ غیر ملکی سکّہ اور سونے کی دنیا کی منڈی کی قیمت کے مطابق مقرر ہوتی ہے۔ دنیا کی منڈی میں سونے کی قیمت ۳۵ روپیہ تولہ سے زیادہ نہیں اور باہمی تبادلہ کی شرح کرنسی بھی مقرر ہے مگر ہمارے ملک میں سونے کا بھاؤ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ مگر شرح تبادلہ غیر ملکی سکّے سے مقرر رہی رہتی ہے اس لئے ہمارے ملک کا سونا جو ۱۴۰ روپیہ تولہ بکتا ہے دنیا کی منڈی میں ۳۵ روپیہ پر ہی چلتا ہے ورنہ غیر ملکی ادائیگی ہمیں ڈالر اور پونڈ میں کرنی پڑتی ہے کیونکہ یہ سکّے سونے کے برابر یا سونا ہی سمجھے جاتے ہیں اسلئے ہمارا انحصار برآمد پہ ہے۔ برآمد کی وجہ سے ہمیں ڈالر اور پونڈ ملتا ہے اور ہمارا سونا ملک کے اندر رہتا ہے ورنہ باہر بھیجنے کی صورت میں ہمیں خسارہ رہتا ہے اور باہر سے بے تحاشہ درآمد کی وجہ سے ملک کے اندر مالی تلاطم پیدا ہو کر ہر چیز کی قیمت فضاء میں اُڑنے لگتی ہے اور یہ زیادتی پیداوار کی زیادتی کی وجہ سے نہیں بلکہ روپیہ کی زیادہ آمد کی وجہ سے ہوتی ہے جو عارضی اور تکلیف دہ اثرات دیرپا چھوڑنے کا موجب

ہوتی ہے۔

فقط ایک اندیشہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ سونا بذاتِ خود اپنی برتری اپنے ہمراہ صدیوں سے لایا ہے اسلئے اپنی قدر و قیمت کی وجہ سے عزّت پا چکا ہے اور کاغذی نوٹ پر انحصار افرادِ حکومت کی دیانت اور دانشمندی پر چل سکتا ہے۔ صورتِ اوّل چونکہ آسان ہے اس لئے لوگ اسے ترجیح دیں گے اور دیتے ہیں۔ ورنہ اگر کسی وقت افرادِ حکومت سے دیانت اور دانشمندی سلب ہو جائے تو بغاوتِ عامہ اسے درست کر سکتی ہے چین میں کمیونسٹوں نے جب قبضہ کیا تو اندرونی اور بیرونی اخراجات کو چلانے اور سنبھالنے کے لئے ان کے پاس نہ تو سونا تھا اور نہ ہی غیر ملکی سرمایہ۔ انہوں نے کاغذی نوٹ کو رائج کیا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ اس کو تسلیم کریں یعنی دولت سمجھیں اور لین دین کریں۔ آخر کام چل نکلا۔ فاتح اقوام بھی مفتوحہ علاقہ میں کاغذی نوٹوں سے جن کے پیچھے کچھ بھی ضمانت نہیں ہوتی، کام لیتی ہیں۔ اس کی مثال جاپان کی ہے۔ مشرقی ممالک برما، ملایا، انڈونیشیا، جہاں جہاں بھی جاپان نے ابتدا میں فتوحات حاصل کیں انہوں نے کاغذی نوٹ کا اجراء کیا تو یہ فقط انہی مفتوحہ علاقوں کے لئے مخصوص تھا۔ اندرون ملک جاپان میں ان کا اپنا سکہ 'ین' اور 'سن' سابقہ قانون کے مطابق جاری و ساری رہا۔

(۱۱) حکومت ہمسایہ قوموں یا ملکوں سے تبادلۂ اشیاء و اجناس کے لئے معاہدہ کرے۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ملک صنعتی ہو اور دوسرا زرعی اور وہ آپس میں اپنی اپنی پیداوار کا تبادلہ کریں۔ اس طرح نئی منڈیوں کے پیدا ہونے سے ایک دوسرے کی پیداوار بڑھے گی اور تبادلۂ سکہ کی الجھن بھی زیادہ نہ ہو گی۔ اس کی مثالیں جرمنی اور اٹلی کی سٹیٹس فیڈریشن ہے۔ جہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں مل کر ایک فیڈریشن یعنی اقتصادی نظام قائم کر لیتی ہیں اور باہمی تبادلۂ اشیاء سے ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ اگر یہ شبہ پیدا ہو کہ ایک ترقی یافتہ متمدّن اور مہذّب ملک جب پسماندہ ملک سے معاہدہ کرے گا تو وہ اس کی منڈیوں پر چھا جائے گا اور اس کو ہڑپ کر جائے گا اور اپنا سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع اٹھائے گا تو اس کا آسان جواب یہ ہے کہ مبادلۂ اشیاء میں ارزانی کی صورت تو ممکن ہے مگر منافع ناجائز یا بلا محنت کا امکان نہیں۔ غیر ملکی سرمایہ فقط پسماندہ ملک کے دفینہ اور ذخائر کو ترقی دیگر خود اور اسی ملک کو فائدہ پہنچائے گا اور قیمتی تبادلہ کی صورت میں زرِ نقد پر ٹیکس کا قانون ہماری حفاظت کرے گا اور عدمِ سود بہتات کی شاہراہ کو مسدود کر دے گا۔ اس لئے ہمیں مغربی تقلید یعنی سونے کے معیار کی پابندی اور سُودی کاروبار کی تائید سے رُک جانا چاہیئے۔ اس کو اپنے ملک سے رخصت کریں اور الوداع کہیں۔

(۱۲) یہ کہ ملک کے اندر بیرونی امداد کا ترقیات کے لئے طلب کرنا یا غیر ممالک کا امداد دیکر ترقیات کی ترغیب دینا خطرہ سے خالی نہیں۔

اوّل۔ بلا دام مفت کی امداد اخراجات پر دلیر کرنے کا موجب ہوتی ہے اولاً ایک دفعہ اس جال میں پھنس کر رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔

دوم۔ اپنی قوت کے استعمال کے لئے سوچنے کی نوبت نہیں آتی اور غیروں کی طرف نظر لگی رہتی ہے جس سے محتاجی کی رُوح پیدا ہوتی ہے۔

سوم۔ امداد کے بغیر پھر کاروباری نظام چلنے نہیں پاتا کیونکہ اس کا انحصار بیرونی امداد کا سہارا چاہتا ہے۔

پاکستان، ہندوستان یا دیگر ممالک کو جو امداد مفت یا سُود پر ملتی ہے اس کے پیچھے ایک نہ ایک غرض مخفی ہے۔ ہمارا ملک اور ہندوستان زرعی ممالک ہیں اور یورپ کے ممالک کے پاس اس قدر اراضی نہیں کہ غلہ، اناج، روئی، بیج، تیل وغیرہ پیدا کر سکیں۔ وہ تو کوئلہ، لوہا اور ایسی دھاتوں سے مشین بنا سکتے ہیں اور یہاں کے خام مال کو تبدیل کر کے اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرتے ہیں۔ باقی سامانِ جنگ ہے تو اس لئے کہ اپنے ملکی حریف کا مقابلہ کر سکیں اور خود اس جنگ کو فردی قوت اور مالی خرچ نہ کرنا پڑے اور اگر جلد جلد یا بغیر سوچی سمجھی پلان کے ملک میں صنعت، کارخانے اور فیکٹریاں بنا دی جاویں اور وہ کچھ دیر چل کر رہ جائیں تو یہ بھی کم مصیبت نہیں۔ اس لئے رفتہ رفتہ خام مال کی پیداوار کے مطابق ضرورتِ ملک کی نسبت سے صنعتی ترقی پر زور دیا جائے۔ ورنہ یہ امداد ملک کے اندرونی نظامِ مال کو توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ جس طرح دریائی پانی کناروں سے نکل کر سیلاب لاتا ہے اور تباہی مچا دیتا ہے اسی طرح زیادہ روپیہ ملک میں مالی سیلاب لاتا ہے جس کے بہاؤ میں نظام و ضبط بہہ جاتے ہیں اور سنبھلنے کے لئے ایک مدت اور کافی محنت درکار ہوتی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان نے جہاں جہاں کی امدادی مشینری لی وہاں وہاں کی حاجتمندی گلے پڑی۔ ہوائی جہاز، موٹریں، انجن، اسلحہ وغیرہ دیکھ لیجئے ان کا استعمال سکھانے کے لئے یا انگریز آئیں یا فرینچ۔ روسی آئیں یا جاپانی۔ اور جب پُرزہ بگڑ جائے تو وہاں کی چیز وہاں کی منڈی کا رُخ کیا جائے اور ان کی خواہش کے مطابق قیمت ادا کی جائے۔ اور ملک کا امن بھی بہت حد تک پھر ان کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ روس نے اوّل اوّل چین میں کانوں میں کھودائی کرنے کی پیشکش کی۔ اس کے ذریعہ سے سڑکیں اور شاہراہیں تعمیر کیں۔ تار، ٹیلیفون اور بنک بنائے، رہنے کے لئے مکانات تعمیر کئے اور حفاظت کیلئے اسلحہ لیا۔ تلاش اور جستجو میں ملک کا چپہ چپہ چھان مارا اور اس تمام علاقہ کے لوگوں اور ذخائر کا اندازہ لگایا اور اسی جاسوسی سے تمام کوائف کا پتہ چلا کر ملک پر قبضہ کر لیا۔ اب روس ہمارے پاکستان میں پٹرول کی تلاش کر رہا ہے۔ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ امریکہ کی ناراضگی سے انگلستان کی بے رخی سے پاکستان کا دل بیٹھنے لگتا ہے کیونکہ امداد کی چسکہ پڑ گیا ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے وظائف مقرر کئے تو حضرت عثمانؓ نے اعتراض کیا کہ اس طرح عرب لوگ تجارت سے غافل ہو جائیں گے اور آبائی فن کو بھول جائیں گے۔ ورنہ جب انہیں وظیفہ نہیں ملے گا تو خونریزی کریں گے یا بھیک مانگیں گے بالکل اسی طرح حضرت علیؓ کے زمانہ میں ہوا۔ دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ اُٹھ گیا بیت المال سے وظائف رُک گئے۔ تجارت کا سہارا اس سے پہلے جاتا رہا تھا۔ اس لئے باہمی جنگ وجدال کی نوبت آگئی اور مسلمان

قوم کا اس قدر خون خرابہ ہوا کہ پہلے تمام غزوات میں اتنا مسلمان شہید نہ ہوا تھا۔

تو یہ امداد بلا علت نہیں۔ یہ تو جاپان اور جرمنی کو راس آئی ہے۔ جاپان میں امریکی فوجیں آگئیں مستقل چھاؤنی قائم ہوئی اور جرمنی میں امریکی اور انگریزی اور فرانسیسی فوج کا مرکز بن گیا۔ جرمنی تباہ ہو چکا تھا۔ اس کی امداد جرمنی کیلئے اور اتحادی فوج کے لئے اور آئندہ جنگ کی روک تھام کی تدابیر کے لئے ضروری تھی۔ نیز ملک میں مزدور، کاریگر اور مستعد قوم موجود تھی۔ جاپان میں سوائے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کے نقصان نہیں ہوا تھا۔ اور ایسے نقصانات زلازل سے اس ملک میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ باقی قوم اور کارخانے سب محفوظ تھے اس لئے اندرون ملک کا نظام ضروریاتِ فوجی اور گرد و نواح کو سنبھالنے کے لئے اس ملک کو سنوارنا آسان تھا۔ اس ملک کو اس قدر امداد کی ضرورت نہ تھی جو صنعتی کاروبار کے لئے ضروری ہو۔ فقط اجازت کی ضرورت تھی وہ دیدی گئی۔ امریکن سپاہی شراب کے دلدادہ تھے۔ جاپان کی وسکی لاکھوں من کی تعداد میں قابلِ فروخت تھی۔ گذشتہ سالوں کے اعداد و شمار کے مطابق ۹۰ لاکھ گیلن وسکی تیار ہو کر فروخت ہوئی اور جاپان کو ۴½ کروڑ ڈالر فائدہ سالانہ ہوتا رہا۔ اتفاقی امداد ایسی ملی جس سے جاپانی سکہ کی ساکھ قائم رہی اور مالی نظام کو جنبش نہ ہوئی ورنہ یہاں بھی جرمنی کے مارک سکہ کی نسبتِ تبادلہ ایک شلنگ (۱۲ آنے) کے مقابلہ میں ہزاروں مارک کی طرح ہوتی۔ اور آجکل مارک پاکستانی روپیہ کے برابر ہے۔

گذشتہ جنگ میں انگلستان کو سامانِ حرب خرید کرنے کے لئے امریکہ کو سونا دینا پڑتا تھا کیونکہ امریکہ کا قانون ہی نقد فروخت کا تھا۔ پھر امریکہ سے انگلستان نے قرض لیا جس کا سُود معمولی شرح سے مقرر کیا گیا۔ بایں ہمہ جنگ کے اختتام پر انگلستان مالی بےکسی سے بےبس ہو کر امریکہ سے ملتجی ہوا کہ سُود معاف کر دیا جائے تب وہ اصل زر ادا کر سکیگا ورنہ نہیں۔ امریکہ نے منظور کر لیا اور دورانِ جنگ ایک ایسا بھی وقت آیا کہ انگلستان باوجود صدیوں کے سونے کے انبار رکھنے اپنی شہرت کے اور بیرونی ممالک کے مقبوضات کے اسلحہ بھی خرید کرنے کے قابل نہ رہا اور جنگ پوری شدت کے ساتھ سر پر آن پڑی۔ ایسے وقت میں "اُدھار پٹہ" کا قانون امریکہ نے پاس کر کے انگلستان کی مدد کی یعنی اسلحہ جہاز، کشتی وغیرہ سب اشیاء بغرض استعمال اُدھار دینا منظور کیں تاکہ اختتام پر جو چیزیں بچ جائیں وہ واپس کر دی جائیں۔ اس سے زائد کچھ مطالبہ نہیں تھا۔ اس لئے ترک سُود اور اصل زر کی وصولی کا مطالبہ کچھ مشکل نہیں۔ سودی آمد کا میزانیہ اگر دنیاوی سطح پر تیار کیا جائے تو انسان اس کی تباہ کاری سے لرزہ کھا کر گر پڑے کہ یہ غیر مرئی وبا کس قدر مہلک ہے جس سے حکیم مطلق عالم کل نے ہمیں انسانیت کے نام پر روکا تھا اور یہ قرآن مجید کی بڑی بھاری فضیلت ہے کہ اس نے سُود کی حرمت کا اعلان فرمایا اور اسلامی تمدن کی بنیاد ایسے طریق سے رکھی کہ اس میں سُود کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ سُود قوموں کی تباہی کا بھی موجب ہے اور افراد کے لئے بھی ہلاکت کا پیغام ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے سُود کو حرام ٹھہرایا ہے۔

حصّہ سوم

ایک زمانہ تھا کہ اولمپیا میں دوڑ میں اوّل آنا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا یا کسی رومن سپاہی سے شمشیر زنی کر کے اس کو پچھاڑ دینا فخر کا موجب تھا۔ کبھی فصاحت وبلاغت کا دَور تھا۔ کبھی زورِ بیان اور شعر وشاعری قابلِ قدر شے تھی۔ حالات کے تغیّر کے ساتھ ساتھ فوقیت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ نیوٹن نے سائنسی انکشافات کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ وہ نہ تو کھیل کے میدان میں دَوڑ میں شریک ہُوا اور نہ ہی اُسے تیغ زنی سے کچھ نسبت تھی۔ اب آج فوقیت کے لئے مال ودولت کا دَور ہے۔ جس کے پاس سونا چاندی زیادہ ہوگا وہ آج کی دَوڑ میں بڑھ جائے گا۔ جیسے اس سے قبل ذکر آچکا ہے بنی اسرائیل کو مال جمع کرنے کا شوق ہی نہیں بلکہ وہ اس فن کے بہت ماہر ہیں۔ پہلے ان کا مقابلہ کرنا پھر ان کو مقابلہ میں شکست دینا بڑی بات ہے۔

یہود تجارت اور سُود کے زور پر مال ودولت کما رہے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں دینی کتاب توریت اور اپنے کاروبار کی بنا پر دنیا میں فوقیت لے گئے تھے مگر ان کی کتاب کو مسلمانوں کی کتاب نے منسوخ کر دیا اور ان کی فوقیتِ مذہبی کو چھین لیا۔ تجارت کو اسلام نے جائز اور سُود کو حرام قرار دیا۔ اس لئے اس خیال سے کہ سُود حرام ہے، جو لیتا ہے اُسے خدا پوچھے گا، اس سے کام نہیں چلے گا بلکہ اسلامی تعلیم کی برتری کے لئے تجارت کا وجود اور سُود کا مفقود ہونا اور پھر میدانِ عمل میں اس قوم کو سبق دینا نہایت دانشمندی کو چاہتا ہے۔

گوسالہ سامری کے واقعہ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ سونے کی آواز گو بے معنی ہو اس کی قوم اس کی عبادت کرنے لگتی ہے اور خدائی وحی کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے۔

اہلِ مکہ کی زندگی کا دار ومدار باہمی تعاون پر تھا۔ جملہ باشندگان چندہ کر کے ایک قافلہ تجارت تیار کر کے گرمی وسردی میں شام وغیرہ کی طرف روانہ کرتے تھے اور منافع سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ گویا کہ تجارت محدود ذرائع کو وسیع کرنے اور تنگیٔ رزق کو فراخی میں بدلنے کا موجب تھی۔ آجکل سفر وسیاحت اسی لئے مشکل ہو گئی ہے کہ لوگوں میں تجارت کا میلان نہیں رہا۔ ورنہ عرب ایک جگہ کی اشیاء دوسری جگہ لے جاتے، وہاں کے باشندوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور منافع بھی اٹھاتے اور دیگر فوائد سے متمتّع ہوتے۔ پس ماضی سے عبرت لے کر حال کو بہتر بنانا ضروری ہے۔

ربوہ ہمارا مرکز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر ایک نبی کو برپا کیا اور فطرتی آزادیٔ ضمیر ادراک وفہم کی شمع کو روشن کیا ہے۔ ہم نے عقائد وتخیّل کی دنیا میں اپنے ٹھوس دلائل اور قوتِ بیان سے فتح پائی ہے لیکن اس طریقِ کار کے ساتھ ساتھ معاشرتی حالت کا عمدہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ابتدائی زمانہ میں بھوک پیاس چنداں دکھ نہیں دیتی۔ نبی کے زمانہ کا خمار سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ مگر اب احمدیت پر ۷۰ سال کا عرصہ گزر رہا ہے۔ اب ربوہ میں مکان ہیں، کوٹھیاں ہیں، تانگے ہیں، موٹریں ہیں،

ریڈیو ہیں، بجلی ہے، پردے ہیں، فرش ہیں، فرنیچر ہیں اور دیگر سامانِ راحت موجود ہیں۔ اگر ان سے آنکھیں بند کرلی جائیں تو محال ہے ورنہ ان کی خواہش اور شوقِ حصول ہونا ضروری ہے اور اس کے لئے مال کی ضرورت ہے۔ اگر ان حالات میں مناسب آسانی نہ ہو تو یا تو ذہنی نشوونما اپنے کمال کو نہیں پہنچے گا یا حسد و مقابلہ کی آگ اسی یک جہتی اور ہم آہنگی کو تاراج کردے گی جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم میں پیدا کیا ہے تو اس کا مناسب علاج یہ ہے کہ ہم ایک نمونہ تجارت کا پیش کریں جو صحیح معنوں میں اسلام کی تعلیم کا شاہکار ہو۔ تجارت ہو لیکن سود نہ ہو اور اس کا نتیجہ خوشحالی ہو اور قوم اس پر فخر کر سکے۔ ربوہ کو ایک مثالی شہر کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں۔ اس میں ایک تازہ شادی شدہ جوڑہ آباد ہوتا ہے۔ اس کے اخراجات اور آمد کا موازنہ پہلے دیکھئے:-

روپیہ ماہوار		سالانہ آمد
مرد انجمن کا ملازم ہے۔ آمد	۱۰۰ × ۱۲ =	۱۲۰۰ روپیہ
خرچ	=	۱۶۸۸ "
		قرض سالانہ = ۴۸۸ روپیہ
		ماہوار قرضہ ۴۰/- "

اخراجات

(۱) رہائش

	روپیہ
ماہوار کرایہ مکان	۱۲
بجلی	۳
پانی	۵
صفائی	۲
دھوبی	۳
نائی	۲
ماہوار =	۲۷
سالانہ =	۳۲۴

(۲) خوراک

	روپیہ
آٹا	۲۴
گھی	۲۴
لکڑی	۱۲
چینی	۶
چائے	۳
سبزی گوشت دال	۱۲
نمک مرچ مصالحہ	۴
ماہوار =	۸۵
سالانہ =	۱۰۲۰

برتن اور بستر شادی میں ملے ہیں ان کا اندازہ نہیں۔

میزان کل

۱- رہائش	=	۳۲۴
۲- خوراک	=	۱۰۲۰
۳- پارچات	=	۱۹۷
۴- چندہ	=	۱۷۷
		۱۶۸۸

(۳) پارچات سادہ

۳ جوڑے پاجامے میاں بیوی	۳۶
۳ جوڑے قمیص " "	۳۶
پگڑی و دوپٹہ	۲۰
جوتے دو عدد	۲۵
کوٹ دو عدد	۲۵
چادر گرم ایک عدد	۳۵
سالانہ	۱۹۷

(۴) چندہ جات

وصیت	۱۲۰
تحریک جدید	۱۰
وقف جدید	۶
جلسہ سالانہ	۱۰
اخبار الفضل	۲۵
خدام الاحمدیہ	۶
سالانہ	۱۷۷

مہمان نوازی سے پرہیز، دوائی کیلئے صفر
صدقہ و خیرات کا خانہ خالی - مرمت، پالش، ٹوٹ پھوٹ کا ذکر نہیں۔

اہلِ ربوہ کی خوشحالی کے لئے اور قومی بہبودی کیلئے جو فوائد مرکز کی وجہ سے حاصل ہو سکتے ہوں وہ قومی سطح پر ہونے ضروری ہیں۔ مثلاً اگر کمیٹی پانی نہیں لا سکتی تو ایک احمدیہ کمپنی بنائی جائے جو حوض اور نالیاں بنائے اور گھر گھر پانی پہنچائے۔ اور جوں جوں آبادی بڑھے گی آمد اور کاروبار بڑھے گا۔ اس کمپنی میں انجمن کے حصص کے علاوہ اہلِ ربوہ کے ہر گھر کو خصوصاً اور باقی جماعت کو عموماً حصص کی خرید کی تاکید کی جائے۔ تاکہ سب کی ذمہ داری ہو اور منافع یکساں ہو اور شکایت کم۔

اسی طرح ٹرانسپورٹ ہے۔ کیونکہ رفاہِ عامہ کے کام کا چند افراد کے ہاتھ میں دینا منافع خوری کو بڑھاتا ہے اور مقابلہ کو کم کرتا ہے اور قومی شے کی وسعت کو تنگ دکھایا جاتا ہے۔ یہ کاروبار بھی ایک کمپنی کرے جس میں انجمن اور اہلِ ربوہ تمام اور باقی جماعت کے افراد حسبِ خواہش شمولیت اختیار کریں اور نفع اٹھائیں۔ اس طرح ایک تو مرکز کی رونق بڑھے گی دوسرے مالی حالت اچھی ہوگی۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ ایک "بنک آف ربوہ" قائم کیا جائے جس کی ابتدائی شاخیں بڑے بڑے شہروں میں ہوں۔ احمدی ملازم اپنے اخلاق اور خدمتِ خلق کی روح سے عوام کی خدمت کریں۔ تجارتی کاروبار میں ہاتھ ڈالیں۔ سرمایۂ ابتدائی کی فراہمی کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ انجمن کا تمام روپیہ بنک میں منتقل ہو سکتا ہے اور نکالا جا سکتا ہے حصص جماعت اور انجمن میں فروخت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہم تجارت کے میدان میں تمام وہ سہولتیں جو سرمایہ داروں کو ملتی ہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارا کاروبار بے شک بلا سُود ہوگا۔ بنک کی قوتِ اُدھار غیر معمولی طور پر بڑھتی ہے اور اسے کاروبار میں لگا کر منافع پیدا کیا جا سکتا ہے اور محفوظ جگہ پر سرمایہ لگانے کے لئے ابھی بڑی گنجائش ہے اور تجارتی کاروبار کے لئے بھی فی الحال کئی ایک بنک اور کھولے جا سکتے ہیں۔ جس طرح مذہب کا میدان علیحدہ ہے اسی طرح تجارت کی منڈی بھی سیاستِ ملک سے علیحدہ ہے جہاں خاموشی سے کام کیا جا سکتا ہے اور کوئی فرقہ وارانہ انگیخت رخنہ اندازی نہیں کر سکتی۔

بنک کی آمد کے ذرائع سُود کے علاوہ بھی اس قدر ہیں کہ محنت اور خوش اخلاقی اور دُور بینی سے جلد ترقی کی جا سکتی ہے۔ قوم میں بچت کی رُوح پیدا ہوتی ہے۔ تجارت کی طرف رغبت اور خوشحالی چپ چاپ اندھیرے میں اچانک رقص کرنے لگتی ہے۔ قلیل سرمایہ کی ابتداء کروڑوں تک کا سرمایہ تھوڑے عرصہ میں جمع کر سکتی ہے اور اخراجات معمولی رہتے ہیں تفصیل اس سے قبل عرض ہو چکی ہے۔ سب سے بڑی احتیاط یہ ہونی چاہیئے کہ زمینداری اور زمینوں کے کاروبار میں بنک کا روپیہ صرف نہ کیا جائے۔ اور قرض بلا سُود ہو مگر بضمانت جائیداد۔ اقساط آسان ہوں لیکن اخراجات کا بار بجنسہٖ قبل از وقت اصل رقم میں جمع ہو اور وقت مقررہ کے اندر ادائیگی ہو تاکہ کاروبار میں رکاوٹ نہ ہو۔

بنک کی موجودگی سے تجارتی دنیا میں جماعت کی ساکھ بڑھ جائے گی۔ بنک کے چالو حسابات میں تو سُود کی خواہش کم ہوتی ہے اور روپیہ کی آمد و رفت اس آمد کی غیر مستقل شکل پیدا کر دیتی ہے جس سے عدم ادائیگی بچت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ البتہ معیّنہ میعاد کے لئے رقوم رکھنے والے توقع کرتے ہیں کہ ان کو منافع یا سُود ملنا چاہیئے ورنہ وہ اپنا روپیہ سُود دینے والے بنک میں رکھیں گے۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ چونکہ یہ روپیہ کاروبار میں لگا ہوگا اس لئے زرِ نقد ٹیکس سے محفوظ رہے گا اور منافع تجارتی میں بلا تعین شرح شرکت قابلِ عمل ہوگی اور اس میدان میں قدم رکھنے سے ہمیں حکومت اور باقی دنیائے بنک کا تعاون حاصل ہوگا اور یہ واحد ادارہ ہوگا جو بلا سُود کام کرے گا۔ تاکہ کم سے کم مسلمان دنیا اس بنک کے گوشوارہ کے مطالعہ سے معلوم کر سکے کہ سُودی کاروبار ترک کرنے سے ہمارے لئے تجارت کا میدان تنگ نہیں ہوتا۔ ایک حربہ جو ایک وقت میں کامیاب ثابت ہوتا ہے دوسرے وقت میں تنزل کا موجب بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کی جنگجو طبیعت کے لئے جب جہادِ سیف رُک گیا تو باہمی زور آزمائی نے اُن کے عروج پر شامِ زوال کا رنگ چڑھا دیا۔ مغربی اقوام نے سُود اور سونے کی چمک سے دنیا کو مغلوب کر لیا لیکن اس زمانہ میں غریب دنیا بیدار ہو گئی ہے اور اب سرمایہ داری سر چھپانے کی جگہ تلاش کر رہی ہے۔ انقلاب فرانس اور روسی کمیونزم نے امراء اور مال و دولت کے ناجائز قبضے تقسیم اور مصرف نے غرباء اور عوام میں نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور ساتھ ہی ان میں اپنی حالت کو بدلنے کی قوت پیدا کر دی ہے۔ اب مذہبی، سیاسی یا اخلاقی طاقت غرباء کو مقابلہ اور زور آزمائی سے نہیں روک سکے گی جب تک ان کی مالی حالت سدھر نہ جائے اور ان کی ضروریاتِ حقہ پوری نہ ہوں اسلام میں معاشرتی اور سیاسی نظام کے لئے لچک موجود تھی مگر اس کو استعمال نہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب فتوحات کی حدود وسیع سے وسیع تر ہو گئیں تو ان کے مطابقِ حال نظم و نسق قائم نہ رہ سکا اس امر کا موازنہ کرنا ضروری تھا کہ جنگ کی حالت میں قوت کا ایک ہاتھ میں جمع ہونا کامیابی کا موجب ہوتا ہے۔ جیسے ابتدائے زمانۂ اسلام میں ہوا۔ مگر جب خلفائے بغداد ورثتاً بادشاہ ہونے لگے جن میں تمام کے تمام اعلیٰ قابلیت اور صلاحیت کے نہ تھے نظام میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اُندلس اور مصر میں علیحدگی کی وجہ سے اسلام نے پھر قوت پکڑ لی۔ تو جہاں ایک وقت میں قومی طاقت کو ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں دوسرے وقت میں اس کو پھیلانے کی حاجت ہوتی ہے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں اگر معاشرتی پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ اگر ایک بنک بلا سُود کاروبار کرنے کے قابل ہو جائے تو بطور نمونہ اس کی مثال سے دوسرے اتباع کر سکیں گے اور اس کام کو بھی ہمیں ہی سر انجام دینا چاہیئے۔ یہ کوئی مشکل امر نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری قومی آمد مسلسل ہے، بڑھ رہی ہے کم نہیں ہو رہی۔ اگر یہی روپیہ بنک میں رکھا جائے تو اس کی اور حیثیت ہوگی اور اگر یہ مال گھر میں یا انجمن کے خزانہ میں بند رہے اس کی قیمت صورت اوّل سے کم ہوگی۔ روپیہ پیسہ کو سنبھالنے والے ایسے ہی اشخاص ہونے چاہئیں جن میں اس کی سوجھ بوجھ ہو۔ اور دیگر شعبہ ہائے کار کے مشیر وہ لوگ ہونے چاہئیں جن کو اس شعبہ سے واقفیت اور دلچسپی ہو اور یہی طریق کامیابی کا ہے۔ جماعت احمدیہ کا بنک زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کی تجاویز کرے۔ اور سلسلہ تبلیغ و اشاعت کے ذرائع سوچے۔ اس طرح دونوں صیغے علیحدہ علیحدہ آزاد بھی ہوں اور خلیفۂ وقت کے تحت اور زیر نگرانی بھی۔ لیکن یہ خیال رہے کہ

(الف) جماعت بڑھتی رہے اور چندوں میں اضافہ ہوتا رہے۔

(ب) یا جماعت حالیہ چندوں میں اضافہ کرے اور

(ج) یا پھر وصیت کی جائیداد میں زیادتی ہو۔

الف۔ یہ ملکی حالات پر منحصر ہے۔ اس میں موجودہ روکیں ایسی ہیں کہ خوشگوار پہلو جلدی نظر نہیں آتا۔ باقی دونوں صورتوں میں سابقہ بوجھ میں اضافہ ہے۔ جو ترقی نہیں کہہ سکتے۔ البتہ مجبوری ضرور ہے۔ اور جائیداد کا ٹکڑوں کی صورت میں قائم رکھنا گھاٹا ہے۔ اسلئے وصیت کی جائیداد کی زمین اور مکان کے حصے مرحوم کے اقرباء میں رعائتی قیمت پر فروخت کرکے زرِ نقد حاصل کرنا چاہیئے اور اس سے تجارت بڑھانا چاہیئے۔ بنک کی موجودگی میں مالی سہولتیں میسر آ سکتی ہیں۔ وظائف طلباء اور مبلغین کیلئے کافی رقم نکل سکتی ہے۔ بیرونی جماعت ہائے احمدیہ کی مرکزی جماعتیں اپنی شاخوں کا الحاق "بنک آف ربوہ" سے کرکے اس کو بین الاقوامی حیثیت دے سکتی ہیں جس سے زرِ مبادلہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہم پاکستان کی خدمت کر سکتے ہیں، حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

جماعت احمدیہ پر تجارت کی نہ تو کوئی مثل تبلیغ پابندی ہے اور نہ ہی اس کے راستے محدود ہیں۔ بیکاری کو دور کرنے کا، قوم میں خودداری، وقار، شہرت اور اصلاح کرنے کا تجارت بھی ایک ذریعہ ہے۔ تبلیغ میں ایک روحانی اور دلائل کا غلبہ پایا جاتا ہے مگر تجارت میں خوش اخلاقی، نرمی، دیانتداری اور محنت کا زیادہ حصہ ہے۔ غرضیکہ "بنک آف ربوہ" کی اہمیت اس قدر جلد بڑھ جائے گی، کہ دوسرے رشک کرنے لگیں گے۔ ہر قوم میں ہمیشہ تین باتیں قابلِ عمل ہوتی ہیں:-

اوّل۔ اطاعت یعنی وہ ایک قانون، رواج، عادات اور معاشرت کی پابند ہو۔ ایک وقت تک اس طرح امن رہے گا۔

دوم۔ اس مرحلہ پر ذریعہ معاش کی آسانی ہو تا کہ قوم مالی حالت میں پیچھے نہ رہے اور اپنی ضروریاتِ حاضرہ کو بآسانی پورا کر سکے۔ مقابلہ و موازنہ یا حسد و بغض کی نوبت نہ آئے۔

سوم۔ اس مقام پر پہنچ کر جبکہ ایک قانون اور معاشرت ہو اور دولت بھی اس طرح تقسیم ہو کہ قومی ضروریات حاصل ہوں تو اب صرف حکمرانی کا جذبہ رہ جاتا ہے۔ اس کو باہم مشاورت سے تسکین دی جائے تب کسی قسم کی امن میں خرابی پیدا نہیں ہوتی۔

اب ہم دوسری منزل طے کر رہے ہیں جہاں اطاعتِ نظام کے بعد دولت کی فراہمی کا سوال ہے جب جماعت کا تمام روپیہ 'بنک آف ربوہ' میں جمع ہوگا تو اس کی ساکھ اور ضمانت بہت بڑھ جائے گی۔ ایک تو مقامی مرکزی رفاہِ عامہ کے کاموں میں اصلاح ہوگی۔ دوسرے ہم ملک کے مالی نظام میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ ہماری آزادی ہو جائے گی۔ ہمارے بنک کی ضمانت پر ہمیں بیرونی ممالک سے تجارت . . . . اور بیرونی ممالک کی تعلیم و تربیت فنی سے مفاد اٹھانے کا موقع ملے گا۔ اور ہم خاص طور پر اس

شعبہ میں احمدی نوجوانوں کو ٹریننگ کے لئے باہر بھیج سکینگے ہمیں جب تک زندگی کے ہر شعبے میں دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کے وعدے کیسے پورے ہوں گے۔ سکھ قوم دنیا کے ہر کام میں ہاتھ ڈال کر دنیا کے کونے کونے میں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ پنجاب میں انہیں چند سال حکومت کا موقع ملا ہے ہٹلر جرمنی کے چانسلر کو ماہر اقتصادیات کی ہمدردی اور خدمات حاصل تھیں جن کے ذریعہ سے تمام یورپ کے مال و دولت پر اس نے جلد بآسانی قبضہ کر لیا تھا۔ پس مالی ترقی کی ابتدا بنک ہے اور انتہا پھیلاؤ۔ روپیہ کی گردش تیز گردش، سود کی بندش اور انسان کی خدمت۔ مال و دولت انسان کی خدمت پر مامور ہو۔ اور انسان اپنے مولائے حقیقی کے حضور سر بسجود رہے ●

الفرقان "بینک آف ربوہ" والا مضمون ایک نہایت اہم مضمون ہے اس بارے میں دوسرے اہل فکر بھی اپنی اپنی آراء کا اظہار فرماویں۔ الفرقان اسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ کی ایک سکیم کے طور پر شائع کر رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ●

درخواست دعا اخویم مکرم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب فاضل یادگیری حیدرآباد دکن بیمار ہیں احباب دردِ دل سے انکی صحتیابی کیلئے دعا فرمائیں نیز مکرم عبدالستار خاں صاحب ضلع سرگودھا اپنے نومولود بچے کی درازیٔ عمر کیلئے درخواستِ دعا کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ضروری اعلان دفتر الفرقان کے سابق مددگار کارکن غلام غوث صاحب کا اب دفتر سے کوئی تعلق نہیں ہے دوست انہیں کسی قسم کی رقوم الفرقان کے حساب میں نہ دیں۔ (مینجر الفرقان)

خاص معاونین کے لئے درخواستِ دعا

الفرقان کے دس سالہ خریدار حضرات کے اسماء گرامی قلتِ گنجائش کے باعث اس شمارہ میں شائع نہیں ہو رہے تاہم ان سب کے لئے احباب سے دعا کے لئے التجا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے خاص فضلوں سے نوازے۔ آمین

نیز چونکہ آئندہ شمارہ سے مستقل پلیٹ پر نام طبع ہو رہے ہیں اسلئے دس سالہ خریداروں میں سے اگر کوئی دوست اپنے نام و پتہ میں کوئی تبدیلی چاہتے ہوں تو یکم فروری ۱۹۶۳ء سے پہلے پہلے مطلع فرمائیں ـــــــــ (ایڈیٹر)

نئے معاونین کے لئے مزید گنجائش

معاونین خاص کے لئے دعا کی خاطر مزید دو صفحوں کی گنجائش پیدا کی جا رہی ہے۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۶۳ء تک جاری رہے گا انشاء اللہ۔ جو دوست تین ماہ کے اندر اندر آٹھ سال کا چندہ یکمشت یعنی اڑتالیس روپے بھجوا دیں گے ان کے نام اس میں درج ہو جائیں گے۔ انہیں دسمبر ۱۹۷۰ء تک رسالہ بھی ملتا رہے گا اور ان کی اس اعانت کے باعث ان کیلئے دعا کی تحریک بھی ہوتی جائے گی۔ گویا یہ ہم خرما و ہم ثواب والی بات ہے۔ فہرست میں نام آمدہ رقوم چندہ کی ترتیب سے درج ہوں گے اس لئے آپ اس کارِ ثواب میں جلد شرکت فرماویں۔ شکریہ۔

(مینجر الفرقان ربوہ)

"الفردوس"

انارکلی میں

لیڈیز کپڑے کے لئے

آپ کی اپنی

دکان ہے

"الفردوس"

۸۵- انارکلی- لاہور

آنکھوں کی جملہ بیماریوں کے لئے بے نظیر تحفہ

نور کاجل

- آنکھوں کو جملہ بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔
- نظر کو صاف اور تیز کرتا ہے۔
- آنکھوں کو گرد و غبار سے صاف کرتا ہے۔
- آنکھوں میں خوبصورتی اور چمک پیدا کرتا ہے۔
- خارش، پانی بہنا، بھمنی اور ناخونہ کا بہترین علاج۔

بوقتِ ضرورت ایک ایک سلائی آنکھوں میں ڈالیں۔
قیمت فی شیشی ۸؍ علاوہ محصولڈاک و پیکنگ۔

دماغی

دل و دماغ کے لئے بہترین ٹانک جسمانی محنت کرنیوالے طلباء، وکلاء، پروفیسرز، ججز وغیرہ کے لئے بہت راحت و آرام کا موجب ہوتی ہے۔ اسی طرح کثرتِ کار یا تفکرات یا پریشانی کی وجہ سے جن لوگوں کے دل و دماغ کمزور ہو گئے ہیں، سر میں گرانی اور درد ہو گردن اور کندھوں میں درد رہتا ہو ان کیلئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ان کا استعمال آپ کی کارکردگی میں اضافہ اور آپ کی طبیعت میں بشاشت پیدا کرے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

ایک گولی صبح بعد ناشتہ ایک دوپہر ایک شام ہمراہ آب
قیمت فی شیشی ۳۰ گولی پانچ روپے۔

تیار کردہ
خورشید یونانی دواخانہ- گولبازار ربوہ

(طابع و ناشر:- ابوالعطاء جالندھری ٭ مطبع:- ضیاء الاسلام پریس ربوہ ٭ مقام اشاعت:- دفتر الفرقان- ربوہ)

دو تبصرے

محترم فاضل مدیر ہفت روزہ بدر قادیان دارالامان تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) "تحریری مناظرہ (عیسائیت کے بنیادی عقیدہ الوہیت پر)

پچھلے دنوں پاکستان میں عیسائیت کی تبلیغ کا بڑا چرچا تھا معلوم نہیں کہ غیر احمدی علماء نے حکومت کو کوسنے کے سوا خود بھی عیسائیت کے مقابلہ کے لئے کچھ کیا یا صرف کفر سازی سے فرصت نہ ملی پائی۔ لیکن احمدیہ جماعت، جو پہلے بھی اسلام کی طرف ہمیشہ سینہ سپر رہی ہے اور مسیحیت کے نظریات و عقائد کے ابطال میں نمایاں پوزیشن رکھتی ہے۔ وہی اس میدان میں اتری۔ چنانچہ سال رواں میں محترم مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل نے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ "الوہیت مسیح" پر مسیحیوں کے نامور مناظر پادری عبدالحق صاحب کے ساتھ تحریری مناظرہ کیا۔ جس کی تفصیلی روئداد کتابی صورت میں اسوقت ہمارے سامنے ہے۔ جانبین کے تحریری پرچے ۲۳۲ صفحات کی کتاب میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ پر جو بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحی مناظر نے ہر چند اپنی بات کو پیش کرنے کیلئے کچھ منطقی اصطلاحات کا بڑا سہارا لیا ہے اور اپنی طرف سے ایسی ہی موشگافیوں کی بھول بھلیوں میں ڈال کر اپنی علمیت اور لیاقت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے مگر محکم اور واضح دلائل سے مناظر کی تہی دامنی واضح ہے اور پھر جگہ جگہ جس انداز میں اپنے مدمقابل کو خطاب کیا ہے وہ بڑا ہی افسوسناک اور گھٹیا قسم کا ہے۔ باینہمہ احمدی مناظر محترم مولانا نے شروع سے آخر تک پوری متانت، سنجیدگی اور خدا ترسی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور یہ چیز کتاب کے قاری کی طبیعت پر نمایاں اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی ..... الغرض ۲۳۲ صفحات کی یہ کتاب اپنے اندر مفید حوالوں کا بیش قیمت ذخیرہ رکھتی ہے۔ مسیحیوں کے ساتھ تبلیغی گفتگو کے لئے جمع شدہ حوالجات بڑے ہی کارآمد ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ فی نسخہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ الفرقان ربوہ۔

(۲) الفرقان ربوہ کا عیسائیت نمبر۔

محترم مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل کی ادارت میں ربوہ سے شائع ہونیوالے ماہنامہ الفرقان کا اکتوبر و نومبر ۱۹۶۲ء کا مشترکہ پرچہ "عیسائیت نمبر" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کم و بیش سو صفحہ کا یہ مجموعہ عیسائیت کی تردید اور مسیحی نظریات و معتقدات کی حقیقت کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے متعدد بیش قیمت مضامین پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں خود مدیر شہیر کا اپنا مبسوط مقالہ بعنوان "اسلام اور مسیحیت کا موازنہ" ہے جس میں بڑی عمدگی سے اسلام اور عیسائیت کے معتقدات کی تقابلی صورت کو پیش کیا گیا ہے۔ زیر نظر رسالہ میں جماعت کے بزرگ علماء کے بلند پایہ مضامین کے ساتھ ساتھ ہونہار نوجوان فضلاء کے مفید مضامین بھی شامل ہیں جنہوں نے مختلف پہلوؤں سے مسیحیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مسیحیت کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر موجودہ یلغار کے وقت محترم مولانا نے یہ خاص نمبر شائع کر کے جہاں عامۃ المسلمین کو دلائل کے اسلحہ سے مسلح کر دیا ہے وہاں آپ نے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے عطا کردہ "خالد" خطاب کو عملی طور پر ایک بار پھر ثابت کر دکھایا ہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ اس خاص نمبر کی قیمت سوا روپیہ فی نسخہ درج ہے جو مکتبہ الفرقان ربوہ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔"

(بدر ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء)